ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مئی ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۱۱ | شعبان ورمضان ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبر شپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبر شپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	روزہ-ایک اہم عبادت	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	بھارت کی تقدیر، مظالم اور احتجاج	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	ٹوٹے دل کی صدا	محمد فرید حبیب ندوی	۸
۴۔	خاص تحریر	یروشلم-ایک حریم محترم	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۱
۵۔	فقہی مباحث	بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب (قسط-۲)	محمد قمر الزماں ندوی	۱۵
۶۔	اسلامی تعلیمات	عدل اجتماعی کی قرآنی بنیادیں	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۲۱
۷۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۸
۸۔	سلگتے مسائل	طلاق ثلاثہ کے بعد حلالہ پر ہنگامہ	سید احمد ومیض ندوی	۳۰
۹۔	انکار حدیث	احمد امین کے وضع کردہ اصولوں کی حقیقت	محمد فرید حبیب ندوی	۳۵
۱۰۔	حکمت عملی	پیغمبر انقلاب کی حکمت عملی	شان محمد ندوی	۳۸
۱۱۔	گوشۂ رمضان	رمضان کے فضائل ومسائل	پیشکش: محمد فرید حبیب ندوی	۴۵
۱۲۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (آخری قسط)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۹
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	''کلیسا''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۵
	// //	''نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۸
	// //	''تصویر وطن''	کمال اختر قاسمی	۶۱
۱۴۔	آخری صفحہ	ایک سبق آموز واقعہ والدین کے لئے	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۵۔	شعر و ادب	غزل	شعیب احسن اعظمی	

❋ ❋ ❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

بھارت کی تقدیر، مظالم اور احتجاج

اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد سے اب تک حکومتی سطح پر ترقیاتی منصوبوں سے زیادہ علاقائی، نسلی اور مذہبی بنیادوں پر سیاسی منصوبے بنائے گئے، اس طرح مظالم کی نئی نئی کہانیاں لکھی گئیں اور پھر مظلوموں کی طرف سے الگ الگ نوعیت کے احتجاج ہوئے، ظاہر ہے کہ مظلوم ہمیشہ مسلمان یا او بی سی، ایس سی، ایس ٹی رہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بی جے پی کے اس دور حکومت میں مظالم کی تعداد نوعیت میں اضافہ ہوا ہے، مگر طویل مدت سے مسلمان جس جماعت کے حاشیہ بردار ہے اس کا ہاتھ بھی ملک کی یہ تصویر بنانے میں کسی سے کم نہیں رہا، سچر کمیٹی کی رپورٹ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے، تعلیم اور سرکاری نوکریوں کو کنارے رکھیے، تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ ملک کا ہر چوتھا بھکاری مسلمان ہے۔

موجودہ بھاجپائی حکومت کے چار سالہ دور اقتدار میں قانونی دہشت گردی الگ ظلم ڈھاتی رہی، جبکہ بھاجپا کی شہ پر حیوان بن جانے والے انسانوں کے ذریعہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو پیٹ پیٹ کر ہلاک کیے جانے کے واقعات الگ سامنے آتے رہے، ابھی دو دن قبل گجرات سے ایک خبر آئی کہ ایک دلت نوجوان کو محض اس لیے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ وہ گھوڑا پالتا تھا، گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اس کی تصویر اور اس کی موت کے بعد کی تصویر بہت وائرل ہوئی، ۲ اپریل کو ایس سی ایس ٹی ایکٹ میں ترمیم اور رزرویشن کو لے کر دلتوں نے ملک گیر احتجاج کیا، معمول کی زندگی ٹھپ ہو کر رہ گئی، کروڑوں کی املاک تباہ کی گئی، لیکن کیسا زوردار احتجاج تھا کہ حکومت ۲ اپریل کو ہی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئی، دوسری طرف ہمارا احتجاج ہے جو تقریباً ایک سال سے جاری ہے اور ادھر دو مہینے سے ہماری عفت مآب خواتین نے احتجاج کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے، دلتوں کے ایک دن کے احتجاج پر مسٹر ہوم منسٹر نے پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر حکومت کی منشا کے متعلق صفائی دے کر دلتوں کو مثبت پیغام دیا اور مسلمانوں کے کثیر تعداد میں احتجاجی جلسوں کے باوجود پارلیمنٹ میں کوئی بھی ان کی حمایت میں نہ کھڑا ہوا چہ جائیکہ حکومت کی طرف سے کوئی مثبت رویہ ہی آتا، یہی نہیں بلکہ ہمارے احتجاج کے کارٹون بنائے گئے، ان کو کوریج تو کیا دیا جاتا ان کا مذاق بنایا گیا، عین اس وقت جب تین طلاق بل کے خلاف یہ احتجاج جاری تھے عدالت عالیہ نے حکومت سے حلالہ، تعدد ازدواج اور متعہ وغیرہ کے بارے میں اس کی رائے طلب کر لی۔

سچی اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کو کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے، کیوں کہ ہمارے یہاں کا مزاج اور عام مزاج یہ ہے کہ رائے کے اختلاف کو اولین مرحلہ میں گمراہی اور آزاد خیالی، گستاخی و بے ادبی سے جوڑ دیا جاتا ہے، تنقید کو ضیغ وضلال کا نتیجہ قرار دے کر ناقد کو راندۂ درگاہ سمجھ لیا جاتا ہے، اور کم از کم یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ سوچنے اور بولنے والوں کو متملقین اور جی حضوری

کرنے والوں سے بہت پیچھے دھکیل دیا جا تا ہے، یہی نہیں بلکہ جزئیات میں اختلاف رائے اور خالص اجتہادی مسائل میں اختلاف موقف کے سبب "من شذ شذ فی النار" کے طعنے دے کر یزی جہالت کا ثبوت دیا جا تا ہے۔

یہ خدشات اپنی جگہ مگر ہم کو یہ کہنے دیجئے کہ ہمارے احتجاج بے دم ہوتے ہیں، ہمارے نعروں کے پیچھے کوئی طاقت نہیں ہوتی جوان کو حقیقت میں تبدیل کرے، ہمارے یہاں ذاتی اور عارضی مفادات پر مبنی سیاست کی کارفرمائی اپنا کام کرتی ہے، کوئی طویل المیعاد منصوبہ اور ٹھوس پالیسی وحکمت عملی نہیں ہوتی، اس پر مستزاد یہ کہ مسلسل زوال اور ناکامیوں نے ہماری قوم کے اعتماد کو بری طرح سے متزلزل کر دیا ہے، جس کے نتیجہ میں ہمارے یہاں ایک ہی وقت میں کئی کئی بڑی بڑی کانفرنسیں اور الگ الگ احتجاجی جلوس ہوتے ہیں، قومی یکجہتی اور انسانی اقدار کے نام پر کانفرنسوں میں مختلف مذاہب کے پیشواؤں کو بلایا جا تا ہے، مگر جواب میں ان کی طرف سے کبھی ایسا نہیں ہوتا، ان مذہبی پیشواؤں میں سے بعض تو وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور جن کا تجربہ بھی ہے کہ وہ پچیس تیس منٹ گفتگو کرنے کے لئے پینتیس - چالیس ہزار کی رقم ایڈوانس اکاؤنٹ میں جمع کرا لیتے ہیں اور پھر توحید پر ان کی تقریر ماشاءاللہ، ایک صاحب بہت جھوم کر نعت پڑھتے ہیں مگر ستر اسی ہزار ایڈوانس جمع کرواتے ہیں، ایک جگہ تو انھوں نے ستر ہزار جمع کر کے ہڑپ لیے اور تشریف بھی نہیں لے گئے، یہ وہ لوگ ہیں جن کا اپنی قوم میں نہ کوئی وجود ہے نہ اثر، یہ حال ہے ہماری یکجہتی کے لئے کی جانے والی کانفرنسوں اور احتجاجی جلسوں کا جس پر ملت کا بڑا سرمایہ صرف ہوتا ہے، ذاتی مفادات اور سیاسی گٹھ جوڑ کے متعلق میں یہاں گفتگو نہیں کروں گا، حالانکہ تمام کاموں کو بے اثر بنانے میں اس کا بڑا کردار ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اہم چیز یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی متحدہ قومی پالیسی نہیں ہوتی، جس کا بڑا سبب ہماری تنگ نظری ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مسئلہ جتنا باوزن ہوگا اس پر احتجاج بھی اتنا ہی باوزن ہوگا، مگر جب مسئلہ اختلافی ہو، اور اس کی بنیاد ہی غیر یقینی اور غیر مستحکم ہو تو احتجاج کے اثرات وہ مرتب نہیں ہو سکتے جو ہونا چاہیے، تین طلاق کے مسئلہ پر یہی ہوا، ذرا جب پہلی بار یہ مسئلہ اٹھایا گیا اس وقت کا ہمارا ادار یہ پڑھ لیا جائے اور تب سے اب تک کی ہماری کارروائی کا جائزہ لے لیا جائے، ظاہر ہے کہ ہم عوامی اور حکومتی دونوں سطح پر شریعت کی تفہیم وتشریح نہ کر سکے، یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مسلکی تشدد ہمیشہ تفہیم شریعت اور تعارف اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنا ہے۔

ابھی حلالہ کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، پہلے ہی دن دو نقطہ نظر سامنے آ گئے، ایک میں مروجہ حلالہ کو شریعت کا جز ہی نہیں مانا گیا اور دوسرے میں اس کو شریعت کا جز تسلیم کیا گیا، جنھوں نے اس کو شریعت کا حصہ تسلیم کیا انھیں معذور سمجھنا چاہیے مگر یہ کہنا ضروری ہے کہ انھوں نے پھر وہی حرکت کر دی جس سے احتجاج غبارہ بن جایا کرتا ہے، البتہ جنھوں نے اس کو شریعت کا جز نہیں تسلیم کیا ان کے لیے مقام غور وفکر ہے، اول یہ کہ مسلمانوں میں طلاق کے واقعات دوسروں کے بالمقابل بہت کم ہوتے ہیں، مگر جو ہوتے ہیں وہ اکثر تین طلاق کے ہوتے ہیں، پھر بھی حلالہ کے واقعات کم ہوتے ہیں، مگر جو ہوتے ہیں ان کی اجازت اس طرح کیوں دی جاتی ہے، حلالہ کی نیت سے نکاح کی اجازت ایسے ماحول میں کیسے دے دی جاتی ہے جبکہ لوگوں نے اس کو ایک کھلواڑ بنا لیا ہے،

آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لعنت رواج پا گئی، کیوں ایسا ہوا کہ حلالہ ایک عار اور ایک لعنت بن گیا، ہم اب تک یہ کیوں نہ سمجھا سکے کہ حلالہ کا اسلام میں تصور نہیں، ہاں تین طلاق کے بعد اگر یہ مطلقہ کہیں اور شادی کر لے پھر اتفاقاً وہاں بھی اس کا نباہ نہ ہو سکے اور وہ علحدگی اختیار کر لے، پھر زندگی کے کسی موڑ پر اس پہلے شوہر سے بات بن جائے تو اب یہ اس کے لیے حلال ہوگی، کیوں کہ درمیان میں اس کا ایک اور نکاح ہو چکا ہے، ہم کیوں نہ بتا سکے کہ دوبارہ یہ نکاح وطلاق محض اتفاقی ہے، اس میں منصوبہ بندی (Pre plan) کا کوئی دخل نہیں، بلکہ مجھے معاف کیا جائے ابھی ایک اور ریلی ہوئی اور اس میں ایک ذمہ دار شخصیت کے منہ سے یہ بات نکلی کہ حلالہ کومت چھیڑیے، حلالہ کی ضرورت آپ کو بھی پڑے گی، یہ کہہ کر بی جے پی کو مشورہ دیا گیا، حلالہ ایک سزا تھی، حلالہ ایک لعنت تھی، لعنت سے متصف حلالہ کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں، ہاں جو حلالہ سزا ہے اس کی گنجائش ہے مگر وہ بھی ضرورت کہاں سے ہو گیا۔

مسلمانوں کے اکثر احتجاج ملی مفادات اور وسیع تر امکانات سے عاری ہوتے ہیں، بلکہ پسِ پردہ کچھ اور ہی ہوتا ہے، جس سے وقتاً فوقتاً پردے اٹھتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے احتجاجوں اور بڑی بڑی ریلیوں اور کانفرنسوں میں صرف مزدوروں کی گاڑھی کمائی برباد ہوتی ہے، پسِ پردہ طے کیے گئے مقاصد تو پورے ہوتے ہیں مگر قومی سطح کے مسائل ۷۰ سال سے جوں کے توں باقی ہیں، بلکہ ان میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے، فسطائی طاقتوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جس قدر تشویش کا اظہار کیا گیا، افسوس یہ ہے کہ اسی قدر غیر دانشمندانہ رویہ اپنایا گیا، موجودہ منظر نامہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غیر دانشمندانہ پالیسی کے سبب ہندوؤں کو متحد ہونے کی دعوت دی ہے اور آر ایس ایس کے خاکے میں پوری طرح رنگ بھر دیا، ۲۰۱۹ء پھر ان کے نام کرنے کی تیاری مکمل کر دی ہے۔

اس کے برخلاف اگر دلتوں پر مظالم کا جائزہ لیا جائے تو وہ مسلمانوں سے کسی طرح بھی کم نہیں، آج بھی گھوڑے پر بیٹھنے کی وجہ سے دلت نوجوان کو قتل کیا جاتا ہے، آج بھی دلت عورتوں کے ساتھ اونچی ذات کے لوگ بدترین سلوک کرتے نظر آتے ہیں، موجودہ حکومت میں ملک کے مختلف حصوں میں دلتوں پر مظالم کے مختلف ویڈیوز وائرل ہوئے جن سے حکومت اور حکومت کی شہ پر بے لگام لوگوں کی منووادی سوچ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دلتوں کے احتجاج میں بڑا دم ہوتا ہے، جس کا نظارہ جنوری کے پہلے ہفتے میں دلت بنام مراٹھا احتجاج میں دیکھنے کو ملا تھا، اور ابھی اپریل کے پہلے ہفتہ میں بھی مشاہدہ ہوا جب ۱۱/ ستمبر ۱۹۸۹ء کو منظور ہوئے بل ''انسداد استحصال'' میں ذرا سی ضمنی ترمیم ہوئی تو دلت سراپا احتجاج بن گئے، ۲۴ گھنٹے کے اندر حکومت اور عدلیہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، دلتوں کی اصل طاقت ان کی منصوبہ بندی، مضبوط پالیسی اور اتحاد ہے، جو مسلمانوں کے یہاں سرے سے مفقود ہے، ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جس وقت ہمیں سراپا احتجاج بن جانا چاہیے اس وقت ہم خاموش رہتے ہیں، جس کا سبب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہماری نظر ''تملق، بھیک اور کٹورے والی سیاست'' پر رہتی ہے یا پھر ہم مصلحتوں کا شکار رہ کر اپنے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں رہتے ہیں، ایشوز ہمارے یہاں اتنے اہم نہیں ہوتے۔

ابھی جموں وکشمیر کا دردناک واقعہ سامنے آیا، جہاں ایک معصوم بچی آصفہ کی وحشیانہ طریقے سے آبروریزی کی گئی اور پھر اسے

حیوانیت کے ساتھ پتھر سے سر کچل کر ہلاک کیا گیا، اناؤ کا حادثہ سامنے آیا، جہاں ایک ہندو خاتون کو ہوس کا شکار بنایا گیا اور پھر اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ وقت تھا جب منصف مزاج ہندو بھی ہمارے ساتھ کھڑے تھے، حکمراں جماعت ہندوؤں کے تیور دیکھ رہی تھی، یہ مناسب وقت تھا کہ مسلم تنظیمیں کمال دانشمندی سے غیر مسلموں کو ساتھ لے کر بلکہ ان کو آگے رکھ کر پورے ملک کو سراپا احتجاج بنا دیتیں اور حکومتی مظالم کے تئیں حکومت کو معافی مانگنے پر مجبور کر دیتیں، ہم نے ہندوؤں کے مذمتی بیانات بھی سنا اور پڑھا، ہائی کورٹ کی وکیل دیپکا کی ہمت بھی دیکھی اور ہندوؤں کا اس واقعہ پر غصہ بھی دیکھا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں اور ان کی قومی سطح کی تنظیموں کی سرد مہری ناعاقبت اندیشی کا بھی مشاہدہ کیا، صاف واضح ہے کہ اس طرح کے مسائل پر احتجاج سے نہ سیاسی مفادات وابستہ ہوتے ہیں اور نہ خود نمائی کے منصوبے، انتہا تو تب ہوئی جب ناعاقبت اندیش سیاسی بازی گروں نے اس کو ہندو مسلم رخ دینا شروع کر دیا، اور ہندو درندگی کہہ ڈالا، جبکہ حقیقت واقعہ اس کے برخلاف ہے، اسے بھاجپائی غنڈہ گردی تو کہا جا سکتا ہے، ہندوؤں کی حیوانیت نہیں، ابھی کل ایٹہ میں ایک شادی کی تقریب سے رات ڈیڑھ بجے ایک ۸ سالہ معصوم کو اٹھا کر درندے نے درندگی کی، وہ شادی بھی ہندو کی تھی، بچی بھی ہندو تھی اور درندہ بھی ہندو تھا، بلکہ اس کے برخلاف یہ ہوا کہ ہندوؤں میں جو کچھ غصہ بھڑکا تھا اس کو ہماری کانفرنسوں اور ریلیوں اور مودی کی مالا جپنے کے ذریعہ دبا دیا گیا، گویا لگنے والی آگ کے بھڑکنے سے پہلے اس پر پانی کی چھینٹیں ڈال دی گئیں۔

اس موقع پر یہ بھی عرض کرنے دیجئے کہ جس طاقت کے ساتھ ایک عرصہ سے دلت مسلم اتحاد کی بات چلائی جاتی ہے اور مختلف تنظیمیں اس کا نعرہ دیتی ہیں، اب تک نہ اس کا کوئی منصوبہ سامنے آیا اور نہ کوئی خاکہ اور نہ اس کے مظاہر، ہمارا ماننا ہے کہ دلت اپنی بالا دستی کے بغیر مسلمانوں سے اتحاد کے لیے تیار نہ ہوں گے، جس طرح مسلمان آپس میں اتحاد کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن کوئی کسی کی سربراہی و ماتحتی میں رہ کر متحد نہیں ہونا چاہتا، یہ واضح رہنا چاہیے کہ دلتوں سے اتحاد الگ بات لیکن ان کی بالا دستی قائم ہونا مسلمانوں کے لئے مزید خطرناک ہے، کیوں کہ ہندستان کی تاریخ میں دلت ہمیشہ مظلوم رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی دلتوں پر مظالم کرتے آئے ہیں اور اس کا سلسلہ ابھی ۲۰-۲۵ سال پہلے تک جاری رہا، یہی وہ انتقامی جذبہ ہے جس کا حوالہ دے کر انھیں برہمن ہندو بنانے اور مسلمانوں سے ٹکرا دینے میں کامیاب ہوتے ہیں، ہم نے ایک موقع پر دیکھا کہ ملک کی بڑی دلت تنظیم کے ذمہ دار ہندو مسلم اتحاد کی بات پر اس وقت دامن جھٹک کر کنارے ہو گئے جس وقت مسلم بالا دستی کے ساتھ اتحاد کے آثار نظر آئے، ہمارا بامسیف نامی اس تنظیم کے سربراہ کے بارے میں یہ بھی نظریہ ہے کہ وہ خود بھی دلتوں کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جس طرح منوواد کے خلاف بولتا ہے اور حقائق بیان کرتا ہے اس کو نہ میڈیا شائع کرتا ہے اور نہ پولیس چھیڑتی ہے، اگر یہ دونوں باتیں ہی ہوتیں تو شاید اس قدر شک نہ ہوتا مگر تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ اس کے سماج میں ۳۵ سے چالیس سال کی محنت کے باوجود نہ وہ بیداری آئی اور نہ وہ انقلابی سوچ پیدا ہوئی جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے، اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ دلتوں کی کسی بھی احتجاجی تحریک میں اس کی شمولیت نہیں ہوتی، اور ہر ابھرتے دلت لیڈر کو وہ پاگل اور ایجنٹ بتاتا ہے، قوموں کی زندگی میں تیس چالیس سال بہت اہم ہوتے ہیں، ہم نے دلت سربراہ سے ایک معروف مسلم سیاسی چہرے کے ساتھ اتحاد کی بات کی تو اس نے فی

الفوراس کو بھاجپا کا ایجنٹ قرار دے دیا، ہم نے اس سے ثبوت مانگا، تو کہا ایک ہزار ثبوت دے سکتا ہوں۔ بات آئی گئی ہوگئی، مگر قابل توجہ امر یہ ہے کہ متعدد مواقع پر وہ اسی کے ساتھ اسٹیج بھی شیئر کرتے نظر آیا، اور دلت مسلم اتحاد کے کھوکھلے نعروں نیز مظلومیت کی داستان سنانے والے جلسوں میں ساتھ نظر آیا، تو اندازہ ہوا کہ یہ شخص نہ صرف دلتوں کو بلکہ مسلمانوں کو بھی بے وقوف بنا رہا ہے اور ایسے خواب دکھا رہا ہے جن کی تعبیر ممکن نہیں، ایسے شخص کا ہماری مرکزی اور وفاقی حیثیت کی تنظیم کے اسٹیج پر آنا اور اس کے جلسوں میں شرکت کرنا کسی طرح بھی باعث خیر نہیں سمجھا جا سکتا، دلت مسلم اتحاد کی اگر بات کی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ پہلے اپنی تنظیموں کو متحد کر کے ایک منشور تیار کیا جائے اور پھر واضح نکات پر ان سے اتحاد کی بات کی جائے، ورنہ یوں تو الگ الگ شخصیات اور الگ الگ تنظیمیں وقتاً فوقتاً یہ نعرہ لگاتی رہتی ہیں اور ذوق برق پروگرام ہوتے رہتے ہیں، اتحاد منصوبہ بندی اور خاموشی چاہتا ہے نہ کہ پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں کا اعلان، منصوبوں کا افشاء مزید انتشار کا باعث ہوتا ہے، قوت کے مجتمع ہونے سے پہلے ہی دشمن اسے بکھیر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اس ملک کی تقدیر میں مظالم اور احتجاج لکھ دیئے گئے ہیں، ایک تنظیم اور ایک طاقت ہے، جس کے خیمے میں ضرورت بھر اتحاد ہے، قربانیوں کی سو سالہ تاریخ ہے، صبر آزما پالیسیاں ہیں، طاقت کے وسائل پر اب مکمل قبضہ ہے، اس کی طرح مستقبل کی خاموش منصوبہ بندی، صبر آزما پالیسی اور دانشمندانہ طریقہ کار اپنانے کی ہم عادت نہیں ڈالتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ظالم ظلم کرتا رہے گا، مظلوم چیختا رہے گا، یہ پرانی کہاوت ہے اور جمہوریت کی حقیقی تعریف بھی یہی ہے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔

احتجاج کرنا اچھی بات ہے، احتجاج زندگی کی علامت بھی ہے، احتجاج بہت کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونے کے مترادف ہے، احتجاج جمہوری فکر اور جمہوریت کے استحکام کے لیے ضروری ہے، لیکن احتجاج سے پہلے یہ دیکھنا از حد ضروری ہے کہ، احتجاج کی بنیاد کیا ہے، کس مسئلہ پر احتجاج کیا جا رہا ہے، داخلی اتحاد و استحکام کی صورت حال کیا ہے، احتجاج سے فائدہ کس کو حاصل ہو رہا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن ہم سے احتجاج ہی کرانا چاہتا ہے اور ہم دشمن کی چال کو غیر شعوری طور پر اپنے احتجاج سے کامیاب بنا رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ فی الوقت ہمارے احتجاجی مظاہرے بے بنیاد ہیں، بے وقت کی شہنائی کے مرادف ہیں، اس کے نتائج سنگین ہونے کا قوی امکان ہے، مسلمانوں کو از سر نو اس ملک میں اپنی پالیسیوں پر متحدہ غور و فکر کی ضرورت ہے، کیا قیادتیں جن خطرات کو بیان کرتی ہیں اور جن خدشات کا اظہار کرتی ہیں ان کے پیش نظر روایتی انداز فکر سے اوپر اٹھ کر منصوبہ بند طریقے سے، متحدہ طور پر اور دعوتی نقطۂ نظر سے غور و فکر کی ابتدا کی جائے گی؟ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا ورزقنا اجتنابہ۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑پیام سیرت

ٹوٹے دل کی صدا

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''اے اللہ! میں بے بس ہوں، لاچار ہوں، کوئی تدبیر کام نہیں آتی، یہ تو نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کردیا ہے.....ایسے دشمنوں کے جو مجھ پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں؟.....اگر تو مجھ سے ناراض نہیں، تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں تجھے مناتا رہوں گا یہاں تک کہ تو راضی ہوجا''۔

ایک ایک لفظ درد وغم میں ڈوبا ہوا!

ایک ایک جملہ کرب والم کی تصویر!

دس سال سے.....ہاں.....مسلسل دس سال سے وہ غم پی رہا تھا.....درد سہہ رہا تھا۔

اس مدت کا ایک ایک لمحہ اس کی دل شکستگی کا گواہ ہے.....اس دہ سالہ دور کا ایک ایک منٹ اس کے آنسوؤں کا شاہد ہے۔

اس کا دل.....نازک سا دل.....آہ.....کتنی مرتبہ توڑا گیا تھا ان دس سالوں میں۔

کتنی مرتبہ وہ راتوں کو رویا تھا.....کتنی مرتبہ اس کی آنکھوں سے اشک باری ہوئی تھی.....کتنی مرتبہ اس کا دل ریزہ ریزہ ہوا تھا!!

مگر آج.....آج تو نہ جانے کیا ہوا تھا.....آج تو وہ خود ہی ٹوٹ گیا تھا۔

دس سال سے جو درد وکرب اس کے سینے میں دفن تھا.....آج یکلخت وہ زبان پر آ گیا۔

جسے ساری دنیا کی قوتِ برداشت دی گئی تھی.....جسے سارے جہاں کے تحمل سے نوازا گیا تھا.....وہ آج شکوہ کناں تھا.....ذرا سوچو! اس کا دل کس طرح پاش پاش کیا گیا ہوگا!!

ہزار غم اس نے سہے تھے.....ہزار ذلتیں اس نے برداشت کی تھیں.....لاکھوں گالیوں نے اس کے سینے میں چھید کئے تھے.....مگر آج کیا ہوا تھا جو اس قدر بے خود وہ ہو گیا تھا!!

دعا تو وہ روز مانگتا تھا.....مگر آج کی دعا تو عرش کو ہلا گئی تھی.....آج تو فرشتوں کے دل بھی سینے سے باہر آ گئے تھے.....آج تو آسمان پر نوحہ ہو رہا تھا.....فرشتے رو رہے تھے.....آسمان والے گڑگڑا رہے تھے.....سیارگان فلک تڑپ رہے تھے.....چاند ستارے سب ہی ماتم کناں تھے۔

آج تو ذات باری کو بھی جلال آ گیا تھا.....عرش کپکپا رہا تھا.....اللہ تعالیٰ غضبناک تھا۔

آہ!.....کتنی آرزوؤں کے ساتھ وہ گیا تھا.....دل میں

کتنے ارمان سمائے وہ یہاں پہنچا تھا۔

مگر سب نے ٹھکرایا تھا.....سب نے دل توڑا تھا.....سب نے پتھر برسائے تھے.....سب نے خون بہایا تھا.....سب نے غم دیا تھا۔

ستّر اسّی کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا تھا اس نے..... پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے.....زبان پیاس سے سوکھ گئی تھی.....حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے.....مگر کسی نے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیا.....کسی نے دل رکھنے کی خاطر کھانے کو بھی نہ پوچھا.....کیا کوئی بھی نہ تھا جو عزت سے گھر بٹھاتا.....اس کی بات سنتا۔

وہ تو بڑے مہمان نواز تھے.....ان کی سخاوت تو بے مثال تھی.....مگر.....آج کیا ہوا تھا ان کی سخاوت اور فیاضی کو!!.....آج ان کے پاس ایک پردیسی کے لئے ایک گلاس پانی بھی نہ تھا؟

اور پردیسی بھی کون؟.....آہ.....اللہ بھی زمانے کے کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے!!۔

وہ .....وہ تھا.....جس کے لئے یہ کائنات سجائی گئی تھی.....یہ پانی .....یہ پھل .....یہ پیڑ پودے سب اسی کے لئے تھے.....سب اسی کے تھے.....مگر آج اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا!!

تھک ہار کر.....جب کہ سارا بدن چور چور .....اور.....قدم لہولہان تھے.....گرتے پڑتے ایک باغ میں جا پہنچا.....ذرا کچھ دَم ملا تو چوٹ کھائے ہوئے دل کے زخم الفاظ بن کر زبان سے رِس پڑے.....اور .....شکستہ دل.....لڑکھڑاتی زبان.....اور.....اشکوں کے سیل رواں کے ساتھ.....اس نے یہ درد بھری دعا مانگی:

''اے اللہ! میں بے بس ہوں، لاچار ہوں.....یہ تو نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کر دیا ہے، ایسے دشمنوں کے، جو مجھ پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں؟.....اگر تو مجھ سے ناراض نہیں، تو مجھے کوئی پرواہ نہیں''۔

یہ دعا کیا تھی!.....زخم جگر اور سوزِ دل تھا جو دعا بن کر لبوں تک آ گیا تھا.....یہ دل کی وہ ٹیس تھی، جس نے الفاظ کا جامہ پہن لیا تھا.....مگر الفاظ کب جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں.....درد کیسے الفاظ میں ڈھل سکتا ہے!.....یہ تو انسان کی مجبوری ہے کہ اس کے پاس اظہارِ جذبات کے لئے کھوکھلے الفاظ کے سوا کوئی سہارا نہیں.....درد تو درد ہے.....نہ سنایا جا سکتا ہے نہ دکھایا جا سکتا ہے..... اسے تو بس محسوس کیا جا سکتا ہے.....مگر حیف صد حیف ! دوسروں کا درد محسوس کرنے والے ہیں ہی کتنے!.....ایک وہ تھا جو سب کا درد اپنے سینے میں لیے تھا اور'' خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر- سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کی تصویر..... مگر.....اس بے حس دنیا نے اس کا غم بھی نہ سمجھا.....الٹا اسے غم پہ غم.....درد پہ درد.....اور.....زخم پہ زخم دیا۔

اور آج تو ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا.....سنگ دلی اور قساوت قلبی کی حد ہو گئی۔

آج اسے جو درد دیا گیا.....اسے بس اس کے دل نے ہی محسوس کیا ہوگا.....کیا گذری ہوگی اس ننھے سے دل پر.....آج جو اس نے دعا مانگی.....تو.....اس کی آواز ساتویں آسمان تک گونج گئی۔

فرشتے حاضر ہوئے اور اس بستی کو الٹنے کی درخواست

کی.....مگر.....ہائے رے قلبِ رحیم ودلِ شفیق !.....وہ اس موقع پر بھی گویا ہوا تو زبان سے محبت کے پھول ہی جھڑے: ''اے اللہ! یہ نادان ہیں.....اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو ہوسکتا ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ایمان لائیں''۔

آج اس کا دل جس بری طرح پاش پاش کیا گیا تھا.....اسے جوڑنے کی اب ایک ہی سبیل تھی.....اس زمین کی چھاتی پر اس زخم کا کوئی مرہم نہ تھا.....اب تو بس وہی اسے تسکین دے سکتا تھا جس نے اسے پیدا کیا تھا.....اور یہی ہوا بھی.....اللہ تعالی نے اسے تسلی دینے کے لئے ساتوں آسمان سے اوپر اپنے پاس بلا لیا۔

جس طرح ظلم کی انتہا بندوں نے کی تھی.....اسی طرح مالک کی طرف سے محبت کی انتہا تھی.....جس بری طرح زخم لگائے گئے تھے.....اسی درجے کے ٹانکے لگائے گئے۔

آج اس کے محبوب نے اسے اپنے پاس بلایا.....سارے درد پھیکے پڑ گئے.....سارے غم ہلکے ہوگئے.....سارے زخم مندمل ہوگئے.....اس نے بھی سب درد کہہ سنایا.....اور.....محبوب نے بھی ہر درد کا درماں اور ہر زخم کا مرہم پیش کر دیا۔

محترم قارئین! یہ واقعہ حضور ﷺ کے سفرِ طائف کا واقعہ ہے.....جو اپنی سنگ دلی وسختی.....حیوانیت ودرندگی اور دوسری طرف لاچارگی وبے بسی کی بے نظیر مثال ہے.....اسی طرح اس میں معراج کی طرف بھی اشارہ ہے.....جو زخم کے بعد مرہم اور دل شکستگی کے بعد دل بستگی کا سامان تھا۔

یہ واقعہ جب یاد آتا ہے تو خون کے آنسو ساتھ لاتا ہے.....کوئی اسے پڑھے اور سنے.....اور اس کی آنکھیں خشک رہیں.....یہ اس کے بے حس ہونے کی دلیل ہے۔

یہ واقعہ ہمارے لئے عبرت کی داستان.....اور ..... نصیحت کا فرمان ہے۔

یہ دین بڑی قربانیوں سے آگے بڑھا ہے.....اور اب بھی قربانیوں سے ہی آگے بڑھ سکتا ہے.....اس کے پیچھے نبی ﷺ کے آنسو ہیں.....ان کے پسینے کے مبارک قطرے ہیں.....ان کے صحابہ کی قربانیاں ہیں.....اس لئے خدارا! اسے برباد نہ ہونے دیں.....اسے ضائع نہ ہونے دیں..... یہ قربانی مانگتا ہے.....اور اس کے بعد ہی فتح وکامرانی ملتی ہے۔

ہم اتنی بڑی قربانی دینے کے شاید اہل نہیں تھے.....اس لئے اللہ تعالی نے بڑی بڑی قربانیاں پہلے ہی لے لیں.....اب ہم سے جتنا ہو سکے، ہم بھی اس کی ترقی میں حصہ لیں، یہی ہماری سعادت ہے۔

اس دین کو آج بھی بلالؓ وصہیبؓ، عمارؓ وخبابؓ اور سمیہؓ ویاسرؓ کی ضرورت ہے.....اور بڑے خوش نصیب ہیں وہ جو اس سعادت کے لئے قبول کر لیے جائیں.....ہماری کم فہمی یہ ہے کہ ہم عمرؓ وخالدؓ اور سعدؓ ومعاذؓ کو تو دیکھتے ہیں، مگر بلالؓ وخبابؓ کو نہیں دیکھتے.....اور رسول اللہ ﷺ کے قطرہائے اشک وخون کو بھول جاتے ہیں.....اور پھر تمنا کرتے ہیں عہد مدینہ کی!

این خواب است وجنوں است ومحال است!

☆☆☆

❑ خاص تحریر

یروشلم-ایک حریم محترم

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

۲۷ رجب کی تاریخ قریب ہے جو شب معراج کی یاد دلاتی ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسجد اقصی (یروشلم) سے ہوکر نبی کریم ﷺ شب معراج کو فرش زمیں سے عرش بریں تک گئے تھے۔ مسجد اقصی میں آپ نے تمام انبیاء کرام کی امامت کی تھی۔ تمام انبیاء نے آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی تھی۔ یروشلم ایک حریم محترم ہے۔ تصور کی نگاہوں میں براق نور کا قدم ہے، دل زخمی ہے چشم نم ہے ہونٹوں پر نالہ غم ہے۔ زبانوں پر یروشلم یروشلم ہے۔ اب جب کہ ہم نے مسجد اقصی کو کھو دیا ہے شکست آرزو کا فسانہ کیسے رقم ہوسکتا ہے۔۔ ہم مسجد اقصی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ہم ان منافق عرب حکومتوں کو بھی آج یاد رکھیں گے جنہوں نے اسرائیل کے ساتھ خفیہ روابط قائم کر کھے ہیں اور یروشلم پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کو جنہوں نے سند جواز عطا کردی ہے۔ ۲۷ رجب وہ تاریخ ہے کہ جب وہ آتی ہے دل کے سارے زخم ہرے ہوجاتے ہیں، دشت دل میں ویرانی پھیل جاتی ہے، فضا اداس ہوجاتی ہے، سینہ مصروف ماتم ہوجاتا ہے، مسلمان ملکوں کے حکمرانوں کے حوصلے پست ہیں وہ اپنے فرض منصبی سے غافل ہیں۔ مسجد اقصی آواز دے رہی ہے اس کی سرزمین پر یہودیوں کی ناجائز ریاست کا قیام عمل میں آیا، لیکن گردوپیش کے جو عرب ممالک ہیں انہوں نے اس ناجائز ریاست کا خاموش یا ببانگ دہل اعتراف کرلیا ہے اور ان ملکوں کے فرمارواں مسجد اقصی کو فراموش کر چکے ہیں وہ اپنے شبستان عیش میں داد عیش دینے میں مشغول ہیں اور وہ میکدے اور سینما ہاوس اور کاسینو (جوے خانے) کھول کر اپنے عوام کو عیش کوش اور بلانوش بنانا چاہتے ہیں، وہ امریکی ثقافت کو اپنے ملک میں فروغ دینا چاہتے ہیں، وہی ثقافت جس میں خانانی نظام ٹوٹ چکا ہے اور دل کی دنیا اجڑ چکی ہے، یعنی وہی عیش کوشی اور وہی بلانوشی اور وہی اوباشی اور وہی معیار زندگی کا فریب اور وہی دولت وثروت کا عیب، انہیں دین اسلام سے دوری کا غم نہیں اور مسجد اقصی سے مستقل طور پر مہجوری کا درد نہیں، امریکا اور مغربی ممالک میں سائنس کی جو ترقیاں ہیں انہیں حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہے بلکہ وہاں کی تہذیب میں جو عیب ہے اس کو درآمد کرنے کی فکر ہے، جو اپنی سوچ کے اعتبار سے کم عقل اور نادان ہیں وہی اب ولی عہد اور ملک کے پاسبان ہیں، شب معراج اور لیلۃ الاسراء کے موقعہ پر ہم شب معراج کی گذرگاہ فلسطین کو یاد کر رہے ہیں، جواب مقبوضہ ہے اور مغصوبہ ہے ہم مسجد اقصی کو یاد کر رہے ہیں جو ہمارا قبلہ اول تھا اور جو تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ تک ہماری تولیت میں تھا۔ ہماری گذشتہ تاریخ یہ رہی ہے کہ ۶۳۶ء میں حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں مسلمانوں نے ہرقل کی ٹڈی دل فوج کو شکست دی تھی اور خلیفہ وقت حضرت عمر بن الخطاب القدس کی سرزمین پر تشریف لے گئے، جسے اس زمانہ میں ''ایلیا'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، مسلمانوں نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی قیادت میں شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا، حضرت خالد بن ولید کے بعد حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ

میں مسلمانوں کی عسکری کمان آئی تھی۔اس موقعہ پر عیسائیوں کے پوپ نے شہر کی کنجیاں حضرت عمرؓ کے حوالہ کیں اور وہ عظیم معاہدہ انجام پایا جس میں اسلامی اخلاق واصول کے عظیم محاسن کی داستان رقم ہے، وہ معاہدہ آج بھی اپنے زریں اصولوں کی وجہ سے انسانی تاریخ کے لئے فخر کا سامان ہے،اس معاہدہ میں اہل قدس (ایلیا) کو مکمل امان دی گئی تھی اور یہ امان جان ومال دونوں کے لئے تھی، یہ تحریر کیا گیا تھا کہ عیسائیوں کے کلیسا اور عبادت گاہیں سب محفوظ رہیں گی۔ان کے اماکن مقدسہ کو منہدم نہیں کیا جاسکے گا اور نہ ان کے گھروں کو اجاڑا جاسکے گا اور نہ کوئی بزور قوت ان کے گھروں میں سکونت پذیر ہوسکے گا اور نہ کسی کو دین کے بدلنے پر مجبور کیا جائے گا، القدس یعنی ایلیا کی آبادی عیسائیوں پر مشتمل تھی اور عیسائی یہودیوں کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اس معاہدہ میں یہ بھی تحریر تھا کہ اہل ایلیا کے ساتھ کوئی یہودی نہیں رہے گا اور اہل ایلیا کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ رومیوں کو اندر گھسنے نہیں دیں گے،اس معاہدہ پر خالد بن ولید اور حضرت عبیدہ بن جراح اور امیر معاویہ بن سفیان کے دستخط تھے،اس طرح ۱۳ سو سال تک مسجد اقصی اور فلسطین مسلمانوں کے زیر اقتدار رہا، درمیان میں ۹۰ سال کے لئے اس پر صلیبیوں نے قبضہ کرلیا تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے جسے واگذار کرایا تھا، معرکہ حطین میں صلیبیوں کی شکست ہوئی تھی۔

یہ یروشلم کی داستان پارینہ تھی۔گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را۔عہد جدید میں ترکی کی خلافت کے خاتمہ کے بعد جب عربوں کی سرزمین کی بندر بانٹ ہوئی برطانوی فوجوں نے ۱۹۱۷ میں فلسطین کی سرزمین پر جابرانہ قبضہ کرلیا تھا اور پھر معاہدہ بلفور عمل میں آیا جس کی رو سے فلسطین میں ایک ناجائز یہودی ریاست کا قیام ہوا عربوں کے سینہ میں خنجر اتارا گیا اور دنیا کے چپے چپے سے یہودیوں کو لاکر یہاں بسایا گیا،مسلم حکمرانوں نے اس جبر وظلم سے قائم ریاست کو آزاد کرانے کے لئے کچھ نہیں کیا اور کبھی کبھی کوئی بیان دیا تو صرف مسجد اقصی کا ذکر کیا،ان حکمرانوں کو فلسطین اور مسئلہ فلسطین سے کوئی واسطہ نہیں تھا،اب مسلم حکمرانوں نے مسجد اقصی کے سلسلہ میں بھی بیان دینا بند کردیا ہے،اس وقت اسرائیل کی توسیع پسندانہ پالیسی میں مصر وشام اور اردن کے علاقے بھی آتے ہیں،گویا مستقبل میں یہ سارے ملک اسرائیل کی حرص وآرزو کی زد میں ہیں، البتہ یہ امت مسلمہ ہے جو خون کے آنسو رو رہی ہے ۔اسرائیل کے پاس طاقتور ترین اسلحے ہیں،مقبوضہ علاقوں پر اس نے نوآبادیاں قائم کرلی ہیں اور عربوں پر اس کے مظالم کا سلسلہ جاری ہے،فلسطینیوں کے پاس پتھروں کے سوا کوئی ہتھیار نہیں، عرب بچوں نے اور جوانوں نے دور مار آتشیں اسلحہ کے مقابلہ میں ہاتھوں میں پتھر اٹھالئے، اس مقابلہ کا نام انتفاضہ رکھا گیا تھا، اسرائیل نے غیر مسلح عربوں کو اور فلسطینیوں کو گرفتار کرنا شروع کردیا تھا اور کئی ہزار فلسطینی ہلاک ہوئے،اور کئی ہزار جیلوں میں ہیں۔اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہیں۔

امریکی حکومت پر اسرائیل کا اثر ونفوذ بہت زیادہ ہے امریکہ کی پوری سیاست اور تجارت اور اقتصادی قوت قوم یہود کی مٹھی میں ہے۔امریکہ کے تمام بڑے بڑے اخبارات تمام بینک اور صنعت پر یہودیوں کا قبضہ ہے،کس ملک کو اسلحہ دیا جائے اور کتنا دیا جائے یہ یہودی طے کرتے ہیں۔دنیا میں سب سے زیادہ جس ملک کو امریکہ کی مدد ملتی ہے وہ اسرائیل ہے، اسرائیل کے پاس جوہری ہتھیاروں کا انبار ہے جدید ترین ہتھیار ہے،تمام عرب ملک مل کر بھی اسرائیل کی مادی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں،ایسے اسرائیل کا مقابلہ سائنس اور صنعت میں ترقی اور پھر شوق شہادت اور ذوق جہاد اور اللہ کی مدد کے ذریعہ ہوسکتا ہے،عربوں کے پاس نہ سائنس ہے اور نہ ذوق جہاد، البتہ فلم بنی کے لئے سینما ہاوس قائم کئے جارہے ہیں۔کئی عرب ملکوں میں میخانے آباد ہیں بلکہ گھروں میں بھی جام میں لال پری اترتی ہے،عیاشی اور فحاشی کا ماحول ہے عیش وطرب کے ان متوالوں سے فلسطین اور مسجد اقصی کے مسئلہ کے حل کی کوئی توقع نہیں ہے۔اب یہ امت مسلمہ ہے جس کی آنکھ ہمیشہ پرنم رہتی

ہے اور جو زبان پر نالہ غم رکھتی ہے۔ اور وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ عرب حکمران بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے ہیں اور مسجد اقصی کی بازیابی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے، جن حکمرانوں نے سیال سونے کا صحیح مصرف کبھی نہیں کیا اور پوری قوم کو صارفین کی قوم بنا ڈالا، صنعت اور حرفت پر کوئی توجہ نہیں دی، عیش کوشی اور لذت اندوزی میں غرق رہے، ان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انہوں نے حکمرانی کا استحقاق کھو دیا ہے اور انہوں نے اپنی قوم کو بھی بے زبان جانوروں سے بدتر بنا دیا ہے اور بدترین استبدادی نظام قائم کر رکھا ہے، یہ حکمراں اسلام کی رسوائی اور ذلت کا باعث ہیں۔ ان حکمرانوں نے جو جرم کیا ہے وہ تو جرم ہے ہی، لیکن اس جرم پر مہر سکوت نہ توڑنا بھی جرم ہے اور اہل فکر علماء کا خاموش رہنا اور بھی بڑا جرم ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عالم اسلام کی بربادی اور ابتری کی وجہ ان حکمرانوں کا ظلم ہے جو انہوں نے اپنی رعایا پر روا رکھا ہے، ان مسلم ملکوں میں تمام آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں اور حکمراں گروہ کے نظریہ سے اختلاف کرنے والوں کو اذیت ناک تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان حکمرانوں نے اپنے ملک کو صنعتی اور سائنسی پسماندگی میں مبتلا کر رکھا ہے، سچ یہ ہے کہ ان ملکوں میں مسلمان آپس میں نہیں لڑتے ہیں، بلکہ یہ حکمراں ہیں جو ظلم وستم کرتے ہیں اور عوام کو ان کے جمہوری حقوق نہیں دیتے ہیں، یہ عجیب زاویہ نظر ہے جو ظالم حکمرانوں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتی ہے بلکہ محکوموں کا گریبان پکڑنا چاہتی ہے۔ اور عالم اسلام کی ابتری کا عوام کو اور ان کے کچھ اختلافات کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے، یہ کہاں کا انصاف اور کیسی مصلحت پسندی ہے۔ غزہ میں لاشوں کی برات شام میں بموں کی برسات، دوما میں کیمیائی گیس کی بدترین سوغات، مصر میں ظلم وتشدد کی تاریک رات، ان سب کی عجیب وغریب توجیہ یہ کی جاتی ہے مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، میں جب ایسی تحریریں پڑھتا ہوں جس میں حاکموں سے کوئی محاسبہ نہیں کیا جاتا ہے اور ظالم اور مظلوم کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے تو ناطقہ سر بگریبان ہوتا ہے اور میں انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں کہ ایسی تحریروں کو کیا کہوں اور ان کے بارے میں کیا لکھوں۔ عالم اسلام کی ابتری کا اصل سبب حکمرانوں کا شریعت سے دور ہونا ہے اور نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دینا ہے، سائنس اور صنعت اور ٹکنولوجی میں ان ملکوں کا پسماندہ رہنا ہے اور حکمرانوں کا وہ ظلم ہے جو انہوں نے اپنے عوام پر روا رکھا ہے، ان ملکوں میں نہ صنعت اور ٹکنولوجی کی ترقی ہے اور نہ دین سے کوئی تعلق ہے اور جب دین سے تعلق نہیں ہوگا تو دشمن کے خلاف جذبہ جہاد کیسے پیدا ہوگا۔ یہاں اب یہ اہم سوال ہے کہ ہم عوام جو بے اختیار ہیں لیکن عالم اسلام کا درد دل میں رکھتے ہیں کیا کر سکتے ہیں۔

ہم اگر منہ میں زبان رکھتے ہیں تو اپنی تقریروں سے عالمی رائے عامہ تشکیل دے سکتے ہیں، ہم میں سے جن کے ہاتھ میں قلم ہے وہ اپنی تحریر سے ذہن سازی سکتے ہیں، شعور کی بیداری کا کام کر سکتے ہیں، ہمارے لئے جو ممکن ہے ہمیں وہ کام کرنا چاہئے۔ ہم اسی طرح سے اپنی مسئولیت سے بریٔ الذمہ ہو سکتے ہیں، صحابہ کرام کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ رھبان باللیل وفرسان بالنھار تھے، یعنی وہ رات کے عبادت گذار اور دن کے شہسوار تھے، یہ صفت جب تک مسلمانوں میں نہیں پیدا ہوگی عالم اسلام کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ہمارے واعظ اور خطیب اپنے خطبات میں پہلی صفت پر تو کسی حد تک زور دیتے ہیں لیکن دوسری صفت پر بالکل زور نہیں دیتے ہیں، اور آج کے دور میں شہسواری سے مراد پرانے زمانے کی گھڑ سواری نہیں ہے بلکہ ٹینکوں کا اور جنگی جہازوں کا اور جدید اسلحہ کا استعمال ہے، یہ دونوں صفتیں جب تک نہیں پیدا ہوں گی عالم اسلام کی شکست، فتح اور سربلندی سے نہیں بدل سکتی ہے کیوں کہ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات بہر حال ہوگی۔ اس حقیقت کو برسر منبر کہنے بلکہ اس کا صور پھونکنے کی ضرورت ہے، عالم اسلام کے ہر ملک میں، قریہ بقریہ شہر بشہر۔ تاکہ مسلمانون میں عالمی سطح پر رائے عامہ کی تشکیل ہو سکے اور جس ملک کے حکمراں ان دونوں

معیار پر پورے نہ اتریں رائے عامہ ان کو نا اہل قرار دے کر ان کا متبادل تلاش کرے اور اللہ سے مدد طلب کرے۔

مسلم حکمرانوں کی بے راہ روی اور اہل دین پر ان کے ظلم وستم کے واقعات کثرت سے سامنے آتے ہیں، بعض علماء دین، اہل دین کی تحریکات پر اپنی تنقید میں مجدد الف ثانی کے طریق اصلاح کا حوالہ دیتے ہیں اور مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کا قول نقل کرتے ہیں کہ اقتدار کی دہلیز تک اہل دین کو پہونچانے کی کوشش کے بجائے دین کو اقتدار کی دہلیز تک پہونچانے کی کوشش کرنی چاہئے ۔ بلاشبہ مجدد الف ثانی نے اپنے عہد میں حکیمانہ اسلوب اختیار کیا تھا لیکن یہ کہنا کہ ہر دور میں وہی ایک ہی Prototype اصلاح کا طریقہ درست ہے، صحیح نہیں، اور نہ یہ اکبر اور جہاں گیر کا زمانہ ہے اور نہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مشورہ قیمتی ہونے کے باوجود دائمی اور ابدی قدر رکھتا ہے، خود مولانا علی میاں نے حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر کے طریقہ کار کی قطعا مخالفت نہیں کی بلکہ ان کے موقف کی حمایت کی ہے۔اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور کے لئے مجدد الف ثانی کا طریقہ کار واحد نمونہ نہیں جس کی ہمیشہ اور ہر حال میں پیروی کی جائے، جمہوریت کے دور میں رائے عامہ کو ہموار کرنا اور جماعت کی تشکیل بھی اصلاح کا ایک طریقہ کار ہوسکتا ہے اور اگر کسی عالم کا یہ خیال ہے کہ ہر دور میں حکمراں کو صرف وعظ کہنا چاہئے اور نصیحت کرنی چاہئے اور مطلق کوئی محاذ آرائی نہیں کرنی چاہئے تو ایک عرب ملک میں مخلص علماء یہ بھی کر کے دیکھ چکے، علماء نے حاکموں کو نصیحت کی تھی لیکن ان علماء کو محصور اور نظر بند کر دیا گیا اور جرم نصیحت کی ان کو سزا دی گئی۔عرب ملکوں کے بہت سے اہل دین نے اس دور میں اس کے سوا اور کیا کیا تھا کہ پارٹی قائم کی تھی، کتابیں لکھی تھیں اخبارات نکالے تھے تقریریں کی تھیں یا پرامن احتجاج کیا تھا، لیکن ظالم حکمراں جمہوریت کے عہد جدید میں جمہوری کوششوں کو بھی برداشت نہیں کر سکے۔اور اہل دین کو قید و بند اور دار ورسن کی سزائیں دے ڈالیں، اصلاح اور تبدیلی کی کوششوں کا معاملہ اجتہادی معاملہ ہے انسان کو حالات کی تبدیلی کے لئے غور وفکر کے بعد جو طریقہ بہتر ہو وہ اختیار کرنا چاہئے کوششوں کا نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی ''رزلٹ'' کو معیار بنا کر کوشش کے درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ کوششیں بالکل درست تھیں جیسا کہ انبیاء کی کوششیں درست تھیں لیکن بہت سے انبیاء کو ان کی قوم نے آرے سے چیر دیا کیا کوئی یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ انبیاء کی کوششیں غلط تھیں، کوشش کرنے والوں کو اللہ کے یہاں اس کا اجر ملے گا، صرف مادی اور دنیوی کامیابی دراصل کامیابی کا حقیقی پیمانہ نہیں ہے ۔والاخرۃ خیر وابقی ۔

دینی، علمی اور عقلی معیار پر غور وفکر کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم ملکوں میں جب تک یہ مسلم حکمراں اپنے ملک کے لئے سائنس اور صنعت میں ترقی کی صحیح پالیسی نہیں وضع کریں گے اور مغربی طاقتوں کے غلام رہیں گے اور اپنے دیندار علماء اور باشعور عوام کی بات نہیں سنیں گے، دین کے اساطین کو دہشت گرد قرار دیتے رہیں گے، عالم اسلام کی بدنصیبی اور تیرہ شبی دور نہیں ہوسکتی ہے، نہ فلسطین کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور نہ مسجد اقصی کی واگذاری ممکن ہے۔اور نہ رسوائی اور ذلت کی زندگی سے نجات ممکن ہے، رہبان باللیل اور فرسان بالنہار کی صفات پیدا کرنا مسئلہ کا حل ہے لیکن معیار زندگی کو بلند کرنے کی فکر (حب الدنیا) اور شوق شہادت کے فقدان (کراہیۃ الموت) نے آج شکست وہزیمت کے دن دکھائے ہیں اور ہم مقصد زندگی سے اور شوق آخرت سے بالکل خالی ہوگئے ہیں۔ بقول اقبال:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
وہ جنوں چھین لیا حرص وہوس نے تجھ سے
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

☆☆☆

❑ فقہی مباحث (قسط-۲)

بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

مذہبی مذاکرات کرنے والے کے لیے مطلوبہ اوصاف: یہ حقیقت ہے کہ مذہبی مذاکرات کا فائدہ اسی وقت ظاہر ہوگا، جب مذاکرہ کرنے والے ان مطلوبہ اوصاف کے حامل ہوں گے:

(۱) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کے لئے سب پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ وہ عمدہ اخلاق وکردار اور اعلیٰ صفات کا حامل ہو، اور اس کا طرز گفتگو بہتر اور دلکش ہو۔

قرآن مجید نے اس کو یوں بیان کیا ہے "وقولوا للناس حسناً" (البقرۃ:۸۳)، گویا قرآنی تعبیر "قولِ حسن" یہ بنیادی چیز ہے مذاکرہ کی کامیابی کے لئے، یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کو دعوت دینے کے لئے بھیجا تو ہدایت دی:

فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشىٰ (طہٰ:۴۴) تم دونوں اس سے نرم گفتگو کرنا، ممکن ہے نصیحت حاصل کرے یا خوف خدا پیدا ہو جائے۔

ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اصولِ دعوت کے بارے میں فرمایا: ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (النمل:۱۲۵) اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو اللہ کی وحی اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔

صاحب تفہیم القرآن اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہیے، ایک حکمت، دوسرے عمدہ نصیحت، حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع اور محل دیکھ کر بات کی جائے، ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے، جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل ودماغ کی گہرائیوں سے اس مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔ عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان کے لئے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے، اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے، ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے"۔

"جادلهم بالتي هي احسن" اور لوگوں سے مباحثہ کرو

ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔اس کا مقصود مدمقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو۔بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔سیدھے سیدھے طریقے سے اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔'' (تفہیم القرآن جلد۲،تفسیر سورہ نحل)

علامہ ابن تیمیہؒ نے ایک لطیف اشارہ اس آیت کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ مجادلہ حسنہ کے بجائے ''مجادلۃ بالتی ھی أحسن'' کی دعوت اس آیت میں دی گئی ہے۔ولم یقل بالحسنة کما قال فی الموعظة، لأن الجدال فیه مدافعة ومغاضبة، یحتاج أن یکون بالتی ھی أحسن حتی یصلح ما فیه من الممانعة والمدافعة۔ (الرد علی المنطقین: ٤٦٨)

قرآن مجید نے ایک موقع پر حصر اور تحدید کے ساتھ کہا کہ اہل کتاب کے ساتھ ایمان والوں کی گفتگو صرف اور صرف بہتر طریقہ پر ہونی چاہیے۔ولا تجادلوا أھل الکتاب، إلا بالتی ھی أحسن إلا اللذین ظلموا منھم (العنکبوت: ٤٦) اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو، مگر ان کے ساتھ جو ان میں ظالم ہیں۔

بلکہ ایمان والوں کو یہ اشارہ بھی دیا گیا کہ نرمی کا اظہار صرف الفاظ سے نہ ہو بلکہ آواز سے بھی ہو کہ تیز آواز میں مخالف سے بات نہ کی جائے۔لا یحب اللہ الجھر بالسوءِ من القول إلا من ظلم (النساء:٤٨) برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا مگر مظلوم کو اجازت ہے۔

(۲) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کی دوسری خوبی اور وصف یہ ہونا چاہیے کہ فریق مخالف کے ساتھ عام زندگی اور عام سلوک کے اعتبار سے بھی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔اس سلسلے میں انبیاء کرام اور خصوصا رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہم سب کے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔انبیاء کرام اور رسولانِ وقت اپنے مخاطب کفار و مشرکین کو ''یا قوم'' کہہ کر خطاب کرتے تھے جس میں اپنائیت اور محبت کا اظہار ہے۔

خود آنحضرت ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں اور سربراہان مملکت کو جو دعوتی خطوط روانہ کئے،ان میں بھی ان کے مقام ومرتبہ اور حیثیت عرفی کا بھرپور خیال رکھا۔روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ آپؐ نے جب ابوجہل کو دعوت اسلام پیش کی تو اس کو ابو الحکم کے لفظ اور کنیت سے مخاطب کیا جو ابوجہل کو بہت پسند تھی اور جس سے اس کی عزت اور لیاقت کا اظہار ہوتا تھا۔

حاتم طائی نے جب دربار رسالت میں حاضری دی تو آپؐ ان کو اپنے دولت کدہ پر لے گئے اور ان کو بڑے احترام اور توقیر کے ساتھ بٹھایا اور خاطر تواضع کی،ہرقل کے نام جو مکتوب آپؐ نے بھیجا اس میں اس کو ''قیصر روم'' کے لفظ سے مخاطب فرمایا۔

(۳) مذہبی مذاکرہ کی کامیابی کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا جائے اور اس میں جو خوبیاں اور اچھائیاں ہوں ان کا کھل کر اعتراف کیا جائے اور اس میں بخل سے کام نہ لیا جائے،کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص،جماعت اور گروہ میں خیر کے پہلو بھی رکھے ہیں،ان خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ظاہر ہوگا کہ اس سے فریق مخالف کے اندر قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔قرآن مجید نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ألا تعدلوا إعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (المائدۃ:٨) کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کردے،عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔

قرآن مجید میں بکثرت اس کی مثالیں موجود ہیں،آپ غور کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں اہل کتاب کی ناشائستہ باتوں پر نقد کیا گیا ہے وہیں ان میں جو خوبیاں پائی جاتی یا ان کے کسی گروہ میں

اگر کوئی خوبی موجود تھی تو اس کا بہتر طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

آل عمران آیت نمبر ۷۵ میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے: ''بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں تو خزانے کا امین بنا دے تو بھی وہ تجھے واپس کر دیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تو انہیں ایک دینار بھی امانت دے تو تجھے ادا نہ کریں، ہاں یہ اور بات ہے کہ تو اس کے سر پر ہی کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ ہم پر ان جاہلوں کے حق کا کوئی گناہ نہیں، یہ لوگ باوجود جاننے کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں، ہاں البتہ جو شخص اپنا اقرار پورا کرے اور پرہیز گاری کرے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے''۔

(۴) مذہبی مذاکرہ کی کامیابی کے لئے ایک نہایت ہی اہم وصف اور خوبی صبر اور بردباری بھی ہے، کیوں کہ جب کسی مختلف فیہ موضوع پر گفتگو ہوگی تو ممکن ہے بعض باتیں انسانی طبیعت کے خلاف ہوں۔ جس سے انسان کی انا اور غیرت کو ٹھیس بھی پہنچ سکتی ہے۔ اور اس کا وقار مجروح بھی ہوسکتا ہے اس لئے مذاکرہ کرنے والوں کا ظرف اور کمال ہونا چاہیے کہ وہ ایسی باتوں سے متأثر نہ ہوں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ وہ کانٹوں کا جواب پھول سے اور نفرت کا جواب محبت سے دیں، قرآن مجید میں ایسی ہدایات بھری پڑی ہیں اور بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔ خذ العفو وأمر بالمعروف وأعرض عن الجاهلين (الاعراف:۱۹۹) آپ درگذر کو اختیار کریں نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جائیں۔

سورہ فصلت، آیت: ۳۴، ۳۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اور یہ بات انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں اور اسے سوائے بڑے نصیبے والوں کے کوئی نہیں پا سکتا اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آئے تو اللہ سے پناہ طلب کر و یقیناً وہ بہت ہی سننے والا ہے''۔

(۵) مذہبی مذاکرہ کرنے والے کے لئے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کی زبان اور اس کے محاورے سے بھی واقف ہو۔ قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وما ارسلنا من رسول إلا بلسان قومه (ابراہیم:۴) ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام اور رسولانِ عظام نے اپنی اپنی اقوام کو انھیں کی زبان میں مخاطب کیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے کیا ہی خوب لکھا ہے:

واما مخاطبة اهل الاصطلاح باصطلاحهم ولغتهم فليس بمكروه إذا احتيج إلى ذلك وكانت المعانى صحيحة كمخاطبة العجم من الروم والفرس والترك للغتهم وعرفهم، فإن هذا جائز حسن للمحاجة وانما كرهه الائمة اذا لم يحتاجوا إليه. (درء تعارض الفصل والنقل:۱/۴۳)

(۶) فریق مخالف یا مخاطب اگر خود مذہبی مذاکرہ کرنے والے کا رشتہ دار ہو اور خونی رشتہ ہو تو مذاکرہ کار کو چاہیے کہ اس رشتہ کا واسطہ دے کر محبت سے اس کو حقیقت دین سمجھانے کی کوشش کرے اور وحدانیت کا قائل بنائے چنانچہ قرآن مجید میں ایک موقع پر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آزر کو بڑی نرمی پیار اور محبت سے سمجھاتے ہیں اور توحید کا قائل کرنا چاہتے ہیں، اس موقع پر چار چار بار یا أبتِ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، عربی سے واقف اور آشنا حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ یا أبتِ کا یہاں استعمال یا أبی کے مقابلہ میں کیا معانی اور خوبی و گہرائی لئے ہوئے ہے۔ (مستفاد کلیدی خطبہ بہ موقع سمینار الضوابط الشرعیہ المنھجیۃ للحوار بین الادیان۔ مقام دہلی ۲۴/اپریل ۱۳ء)۔

مذهبی مذاکرہ کا موضوع کیا ہو؟

مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان مذہبی، سماجی اور سیاسی ان تینوں امور پر گفتگو ہوسکتی ہے، اور ان موضوعات پر مذاکرہ کیا جا سکتا ہے، البتہ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مذہبی موضوعات پر یا سماجی موضوعات پر نیز سیاسی موضوعات پر جو بھی گفتگو ہوگی، وہ نصوص شرعیہ کی روشنی میں ہوگی، "إن الدين عند الله الإسلام" ومن يتبغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه" اور "يا

أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدو بانا مسلمون'' مذہبی مذاکرہ کرنے والوں کے لئے یہ آیات مکمل گائڈ لائن ہیں، ان آیات کو پیش نظر رکھ کر ہی مذہبی مذاکرہ کی گنجائش ایک ایمان والے کو مل سکتی ہے۔ مذہبی مذاکرہ انجام دینے والے مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اس کا عقیدہ وحدتِ دین کا ہو نہ کہ وحدتِ ادیان کا کیوں کہ وحدتِ ادیان کا نظریہ اور فکر سراسر کفر اور باطل ہے، اگر کوئی مسلمان اس عقیدہ کا حامل ہوگا تو اس کے کافر اور مشرک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

بعض روشن خیال علماء اور جدید مفسرین نے کو قرآن کی یہ آیت کریمہ إن اللذين آمنوا واللذين هادو والنصارىٰ والصائبين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون. سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے اور اس سے انھوں نے وحدت ادیان کا فلسفہ کشید کرنے کی مذموم سعی کی ہے۔ یعنی رسالت محمدیہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، بلکہ جو بھی جس دین کو مانتا ہے اور اس کے مطابق ایمان رکھتا اور اچھے عمل کرتا ہے، اس کی نجات ہو جائے گی۔ یہ فلسفہ سخت گمراہ کن ہے۔

جمہور مفسرین نے اس آیت کا صحیح مطلب اور مفہوم واضح کر دیا ہے، خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف، اسلام ہی ہے۔ إن الدين عند الله الإسلام جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا متلاشی ہوگا وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا۔ اور احادیث میں بھی نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ اب میری رسالت پر ایمان لائے بغیر کسی شخص کی نجات نہیں ہوسکتی، ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری اس امت میں جو شخص بھی میری بابت سن لے، وہ یہودی ہو یا عیسائی پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت ادیان کی گمراہی، جہاں دیگر آیات قرآنی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے، وہاں احادیث سے بغیر قرآن کو سمجھنے کی مذموم سعی کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ اس لئے یہ حقیقت ہے کہ احادیث کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ مذکورہ آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں یہود کی بدعملیوں اور سرکشیوں اور اس کی بنا پر ان کے مستحق عذاب ہونے کا تذکرہ فرمایا تو ذہن میں اشکال پیدا ہوسکتا تھا کہ ان یہود میں جو لوگ صحیح کتابِ الٰہی کے پیرو اور اپنے پیغمبر کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے والے تھے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ یا کیا معاملہ فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ صرف یہود ہی نہیں، نصاریٰ اور صابی بھی اپنے اپنے وقت میں جنہوں نے اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھا اور عملِ صالح کرتے رہے، وہ سب نجات اخروی سے ہمکنار ہوں گے اور اسی طرح اب رسالت محمدیہ ؐ پر ایمان لانے والے مسلمان بھی اگر صحیح طریقے سے ایمان باللہ والیوم الآخر اور عمل صالح کا اہتمام کریں تو یہ بھی یقیناً آخرت کی ابدی نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔ نجات اُخروی میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کیا جائے گا، وہاں بے لاگ فیصلہ ہوگا۔ چاہے مسلمان ہوں یا رسولِ آخر الزماں سے پہلے گزر جانے والے یہودی، عیسائی اور صابی وغیرہ۔ اس کی تائید بعض مرسل آثار سے ہوتی ہے، مثلاً مجاہد حضرت سلمان فارسیؓ سے نقل کرتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے ان اہل دین کے بارے میں پوچھا جو میرے ساتھی تھے، عبادت گزار اور نمازی تھے (رسالت محمدیہ سے پہلے) تو اس موقع پر یہ آیت إن اللذين الخ نازل ہوئی۔

مذہبی مذاکرہ کرنے والے کے لئے چند شرطیں

:: (۱) حوار اور مذاکرہ کی بنیاد وحدتِ ادیان جیسے باطل اور کفریہ نظریہ پہ نہ ہو۔ سارے ادیان کے عقائد اور عبادات کے صحیح و درست ہونے کا نظریہ اور فلسفہ نہ ہو۔ کہ یہ سارے طریقے خدا تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ یہ سراسر باطل نظریہ ہے۔

(۲) مذاکرہ اور حوار میں اس باطل اور غیر اسلامی نظریہ کا ذرہ برابر تصور اور گنجائش نہ ہو کہ سارے مذاہب میں کچھ نہ کچھ خرابیاں

اور اچھائیاں ہیں، اس لئے (نعوذ باللہ) جس مذہب میں جو چیزیں اچھی ہیں اس کو قبول کر لیا جائے اور اسلام مذہب کو بھی ان منسوخ اور باطل مذہب کے مساوی قرار دے دیا جائے۔ اور اس مذہب کے بارے میں بھی اخذ و ترک کا اصول اپنایا جائے۔ اس لئے کہ نعوذ باللہ اگر اس پہلو سے گفتگو کی اجازت دی جائے گی، تو اسلام آخری اور مکمل مذہب قرار نہیں پائے گا اور "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا" کا انکار لازم آئے گا۔

(۳) مذاکرہ کا موضوع اور قرار داد یہ نہ ہو کہ قرآن اور دیگر الہامی کتابوں کو ایک ساتھ دو دفتی کے درمیان شائع کیا جائے اور نہ ہی یہ موضوع ہو کہ مسجد اور گرجا گھر کو ملا کر تعمیر کیا جائے اور ہر مذہب والے دوسرے مذہب والوں کی عبادت گاہوں میں عبادت کر لیں کیوں کہ یہ ساری چیزیں ناجائز اور شرع کے خلاف ہیں۔

(۴) اجتماعی طور پر کسی عبادت کی ادائیگی کا مسئلہ مذاکرہ کا عنوان نہ ہو کہ سب مل کر کسی عبادت کو انجام دیں تاکہ آپسی دوریاں ختم ہوں اور محبت و الفت پیدا ہو، کیوں کہ اسلام میں قطعاً اس کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ مکہ جیسے سخت حالات میں قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون الخ جیسی آیات کا نازل ہونا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اسلام کا کفر کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) مذاکرہ کرنے والے مسلمان کے ذہن میں یہ بات اور عقیدہ سو فیصد پیوست ہو کہ حق اور آخرت کی نجات صرف اور صرف اسلام میں ہے۔

(۶) مذہبی مذاکرہ کرنے والے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ مخاطب کو باور کرائے کہ اسلامی احکام سو فیصد حق اور سچ ہیں اور اس کے دلائل یہ ہیں لہذا مذاکرہ کا عنوان یہ نہ ہو کہ دیگر اہل مذاہب کے رسوم و اعمال کو اپنانے کی حوصلہ افزائی ہو کیوں کہ قرآن صاف کہتا ہے۔ "ومن یتبغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه" الخ "ومن یحکم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون"۔ "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون"۔ "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون"۔ "إن الحكم إلا لله" "إن الدين عند الله الإسلام"۔

یہ آیات صاف بتلا رہی ہیں کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی مذہب حق پر نہیں ہے، حق بس اسلام ہے۔ الغرض خواہ مذاکرہ کا موضوع مذہبی ہو یا سماجی اور سیاسی اسلام کی پاک اور واضح تعلیمات کی روشنی میں ہی مذاکرہ ہوگا۔ دیگر مذاہب کو منسوخ اور باطل قرار دینا اور اسلام کو آخری مذہب اقرار کرانا ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔

مذہبی مذاکرہ کی ابتداء اور آغاز مسلمانوں کی طرف سے ہو: مذہبی مذاکرات کی شروعات اور آغاز مسلمانوں کی طرف سے ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ عالمی امت ہے اور اس امت کی دعوت عالمی ہے۔ اور اس امت کو مکلّف بنایا گیا ہے کہ وہ عام طور پر کفار و مشرکین کو اور خاص طور پر اہل کتاب کو اسلام کی دعوت پہونچائیں اور یہ دعوت حکمت و موعظت اور مجادلہ حسنہ سے متصف ہو اور اسلام سے نیچے اتر کر اور اسلامی اُحکام سے ہٹ کر یہ دعوت نہ ہو، قرآنِ مجید نے اس کی کھل کر وضاحت کر دی ہے یا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم أن لا نعبدو إلا ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضا بعضا اربابا من دون الله الخ۔ اس آیت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حوار اور مذاکرہ کی پیش کش مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ البتہ اگر کفار اور اہلِ کتاب کی طرف سے مذاکرہ اور حوار کی پیش کش ہو اور ایمان والوں کو امید ہو کہ تذکیر و موعظت سے ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے کیوں کہ ان کے اندر طلب ہے تو ایسے مذاکرہ میں شرکت اور حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اگر مذاکرہ غیروں کی طرف سے ہو اور اندیشہ اور خطرہ ہو کہ وہ اس بہانے عیسائیت کی تبلیغ کریں گے اور اس کو ماننے کے لئے ماحول بنائیں گے یا اسلام اور مذہب اسلام کے احکام و قوانین کی تضحیک کریں گے اور اس میں شکوک و شبہات پیدا کریں گے تو پھر اس طرح کے حوار اور مذاکرہ میں مسلمانوں کا شرکت کرنا از روئے شرع درست نہیں ہوگا۔

البتہ باہمی امن وسلامتی اور خوشگوار تعلقات کے قیام کے لئے اور غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے مذاکرہ کرنا جس میں کسی کے اعتقادات ونظریات سے چھیڑ چھاڑ نہ ہو اس کے لئے مختلف مذاہب کا باہم مذاکرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، ایسے مذاکرہ میں ضرور شرکت کریں اور تبادلہ خیال کریں۔لیکن مسلمان کے لئے بہتر ہے کہ وہ مندوب اور مہمان بن کر شریک نہ ہوں بلکہ میزبانی اور ضیافت کا فریضہ خود انجام دیں اور اس موقع پر جو بھی اور جتنا بھی موقع میسر ہو دین اسلام کی دعوت اور تبلیغ سے نہ چوکیں۔

مذہبی مذاکرات میں دیگر مذاہب کتابوں کا حوالہ: مذہبی مذاکرات کے درمیان دیگر مذاہب کے کتابوں کا حوالہ صرف ان مسائل اور تعلیمات میں دیا جاسکتا ہے جو تعلیمات تمام مذاہب میں مشترک ہوں اور وہ قرآن کی تعلیمات کی مزید تائید کے لیے ہوں اور قرآنی تعلیمات سے ہٹ کر نہ ہو مثلا تورات، انجیل اور وید میں آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے اور قرآن کے آخری الہامی کتاب ہونے کا اسلام مذہب کے آخری مذہب ہونے کا ثبوت ہے۔لہذا آپؐ کے خاتم النبیین ہونے اور قرآن مجید کا آخری آسمان کتاب ہونے اور اسلام کا آخری مذہب ہونے کو بتانے کے لئے قرآن کے دلائل کے ساتھ ان آسمانی کتابوں سے (جو محرف اور متبدل ہونے کے باوجود جس میں بہت سے مسلمہ حقائق آج بھی موجود ہیں) حوالہ دیا جا سکتا ہے۔اعلیٰ انسانی خوبیاں جو ان کتابوں میں مشترک ہیں ان کو بھی تحریر وتقریر میں نقل کیا جاسکتا ہے۔توحید ورسالت اور عقیدہ آخرت کے اثبات کے لئے بھی ان کا حوالہ دیا جا سکتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ حوالے اسلامی تعلیمات اور عقائد سے متصادم نہ ہوں۔

قرآنِ مجید کی تفسیر کا ایک مصدر، آسمانی کتابیں اور یہود ونصاریٰ: عہد صحابہ میں تفسیر قرآن کا چوتھا مصدر ومآخذ یہود ونصاریٰ تھے۔یہ اس لئے کہ قرآنِ کریم بعض مسائل میں عموما اور قصص انبیاء اقوام سابقہ کے کوائف واحوال میں خصوصا تورات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔اس طرح قرآن کریم کے بعض بیانات انجیل سے بھی ملتے ہیں۔مثلا حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا واقعہ اور ان کے معجزات وغیرہ۔

البتہ قرآن کریم نے جو طرز ومنہاج اختیار کیا ہے وہ تورات و انجیل کے اسلوبِ بیان سے بڑی حد تک مختلف ہے۔قرآنِ کریم کسی واقعہ کی جزئیات وتفصیلات بیان نہیں کرتا بلکہ واقعہ کے صرف اس جزو پر اکتفا کرتا ہے جو عبرت وموعظمت کے نقطۂ خیال سے ضروری ہوتا ہے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ تفصیلی واقعہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض صحابہ ان واقعات کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے نومسلم اہل کتاب، مثلا عبداللہ بن سلام کعب الأحبار اور دیگر علماء یہود ونصاریٰ کی جانب رجوع کرنے لگے۔مگر اہل کتاب کی جانب رجوع ایسے امور وواقعات کے بارے میں کیا جاتا تھا۔جس کے سلسلے میں صحابہؓ نے آنحضور ﷺ سے کچھ نہیں سنا ہوتا تھا۔اس لئے کہ جو چیز آپؐ سے ثابت اور منقول ہوتی تھی۔اس کے ضمن میں صحابہ کسی دوسرے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔خواہ وہ کسی درجہ کا بھی انسان ہو، اس میں شک نہیں کہ تفسیر قرآن کا یہ مصدر چہارم سابقہ مصادر (قرآن کریم (۲) نبی کریم ﷺ (۳) اجتہاد) سہ گانہ کے مقابلے میں بہت کم اہمیت کا حامل ہے۔اس لئے کہ تورات وانجیل میں تحریف ہوچکی ہے۔یہ فطری بات تھی کہ اہل اسلام اپنے دین کی حفاظت کرتے اور کتابِ الٰہی کو ان محرف کتب کے اثرات سے بچاتے۔اس لئے صحابہ کرام اہل کتاب سے وہی بات اخذ کرتے تھے، جو ان کے عقیدے سے ہم آہنگ ہو اور قرآن پاک سے متصادم نہ ہو۔اس کے خلاف جو بات ہوتی وہ اسے مسترد کردیا کرتے تھے۔بعض باتیں ایسی ہوتیں جو نہ تو قرآن کے موافق ہوتیں اور نہ مخالف۔ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا، نہ تصدیق کی جاتی اور نہ اسے جھٹلایا جاتا۔سرور کائنات آنحضرت ﷺ کا حکم بھی ایسے امور میں یہی تھا کہ نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔(تاریخ تفسیر ومفسرین۔۶۲-۶۳)۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

عدل اجتماعی کی قرآنی بنیادیں

ابوالاعلیٰ سید سبحانی، مدیر ماہنامہ حیات نو، نئی دہلی

موجودہ انسانی دنیا کے بڑے اور اہم ترین سوالات میں ایک سوال عدل اجتماعی (Social Justice) کا ہے۔ اس بات کو کیسے ممکن بنایا جائے کہ انسانی دنیا کا اجتماعی نظام بھی صحیح بنیادوں پر درست انداز سے چل سکے اور ساتھ ہی فرد کی انفرادی آزادی اور اس کے انفرادی حقوق بھی محفوظ رہیں۔

اس سلسلے میں انسانی دنیا نے مختلف قسم کے تجربات کیے ہیں، جن کے نتیجے میں متعدد نظریات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور سیکولرزم عدل اجتماعی کے حوالے سے جدید دور کے بڑے تجربے اور نمائندہ نظریات مانے جاتے ہیں۔

عدل اجتماعی قرآن مجید کا بھی ایک اہم موضوع ہے۔ بلکہ بعض مفکرین نے قرآن مجید سے استدلال کرتے ہوئے اس کو اسلام کا حقیقی مقصود قرار دیا ہے۔ سید ابوالاعلی مودودیؒ سورہ الحدید کی آیت ۲۵/ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ عدل قائم کرے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (سورہ الحدید:۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ انسان انصاف پر قائم ہو، اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت طاقت اور لوگوں کے لیے فوائد ہیں، تا کہ اللہ یہ معلوم کرے کہ کون بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ قوی اور زبردست ہے)''(۱)

عدل اجتماعی کے سلسلے میں قرآنی اپروچ اور جدید نظریات کی اپروچ میں کافی بنیادی اور کلیدی نوعیت کا فرق پایا جاتا ہے۔ سید ابوالاعلی مودودی علیہ الرحمہ عدل اجتماعی کے قرآنی تصور پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عدالت اجتماعیہ درحقیقت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ افراد، خاندانوں، قبیلوں، برادریوں اور قوموں میں سے ہر ایک کو مناسب آزادی بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کو روکنے کے لیے مختلف اجتماعی اداروں کو افراد پر اور ایک دوسرے پر اقتدار بھی حاصل رہے، اور مختلف افراد ومجتمات سے وہ خدمت بھی لی جاسکے جو اجتماعی فلاح کے لیے درکار ہے''۔(۲)

آگے جدید نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے سید مودودی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''جس طرح حریت فرد، فراخدلی (بے لگام) سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کا وہ نظام اجتماعی عدل کے منافی تھا جو انقلاب فرانس کے نتیجے میں قائم ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ اشتراکیت بھی اس کے قطعی منافی ہے جو کارل مارکس اور اینجلز کے نظریات کی پیروی میں اختیار کی جارہی ہے۔ پہلے نظام کا قصور یہ تھا کہ اس نے فرد کو حد مناسب سے زیادہ آزادی دے کر خاندان، قبیلے،

برادری، معاشرے اور قوم پر تعدی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی اور اس سے اجتماعی فلاح کی خدمت لینے کے لیے معاشرے کی قوت ضابطہ کو بہت ڈھیلا کر دیا۔ اور اس دوسرے نظام کا قصور یہ ہے کہ یہ ریاست کو حد سے زیادہ طاقتور بنا کر افراد، خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی آزادی قریب قریب بالکل سلب کر لیتا ہے، اور افراد سے معاشرے کی خدمت لینے کے لیے ریاست کو اتنا زیادہ اقتدار دے دیتا ہے کہ افراد ذی روح انسانوں کے بجائے ایک مشین کے بے روح پرزوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔'' (۳)

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عدل اجتماعی کے سلسلے میں بہت ہی ٹھوس قسم کی بنیادیں پیش کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آزادی، عدل وانصاف، انسانی مساوات، شورائیت، اجتماعی تکافل باہمی، فساد فی الارض کے خلاف مشترکہ جدوجہد، وغیرہ عدل اجتماعی کے سلسلے میں اہم قرآنی بنیادیں ہیں۔

بیسویں صدی کے اسلامی لٹریچر میں عدل اجتماعی کے موضوع پر سید قطب شہید علیہ الرحمہ کی معرکہ آراء تصنیف 'العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام' کافی اہم اور مدلل کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں سید قطب شہیدؒ نے اسلام میں عدل اجتماعی کے مزاج، اسلام میں عدل اجتماعی کی بنیادیں، اسلام میں عدل اجتماعی کے قیام کے ذرائع وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ سید ابوالاعلی مودودی علیہ الرحمہ کی بھی ''اسلام اور عدل اجتماعی' کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع تحریر موجود ہے۔ یہ تحریر مولانا مودودی نے ۱۹۶۲ء میں مکہ مکرمہ میں منعقد 'موتمر عالم اسلامی' کی کانفرنس میں پڑھ کر سنائی تھی۔ بعد میں اسے اسی عنوان سے کتابچہ کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ جدید مسلم مفکرین میں معروف اسلامی فلسفی اور دانشور ڈاکٹر محمد عمارہ (مصری) کی تحریروں بالخصوص تکثیری سماج، مسلم اقلیات، امن اجتماعی اور حقوق انسانی سے متعلق تحریروں میں اس موضوع پر کافی اہم بحثیں ملتی ہیں۔

سید قطب شہیدؒ نے ''العدالۃ الاجتماعیۃ'' میں اسلام میں عدل اجتماعی کی تین بنیادوں کی نشاندہی کی ہے، (۱) آزادئ ضمیر (۲) انسانی مساوات (۳) اجتماعی کفالت باہمی۔ (۴)

جبکہ سید مودودی علیہ الرحمہ نے متعین طور پر عدل اجتماعی کی اسلامی بنیادوں پر گفتگو نہیں کی ہے، البتہ ان کی تحریر کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدل اجتماعی کی تین بنیادیں بیان کرتے ہیں: (۱) انفرادی آزادی (۲) معاشرتی خدمت (۳) استیصال ظلم۔ (۵)

ڈاکٹر عمارہ کا فکری سرمایہ اس پہلو سے امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس میں بہت سی نئی جہتوں اور نئے پہلوؤں پر گفتگو موجود ہے۔ تکثیریت، اقلیات، امن اجتماعی اور حقوق انسانی پر ان کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے عدل اجتماعی کی درج ذیل بنیادوں کی جانب رہنمائی ملتی ہے، آزادی، شورائیت، مساوات، عدل وانصاف، اور اجتماعی مفاد سے متعلق امور کے سلسلے میں مشترکہ جدوجہد۔ (۶)

اس مقالے میں عدل اجتماعی کے حوالے سے مذکورہ بالا بحثوں اور فکری پیش رفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل بنیادوں پر قرآن مجید کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی:

آزادی، عدل وانصاف، انسانی مساوات، شورائیت، اجتماعی تکافل باہمی، فساد فی الارض کے خلاف مشترکہ جدوجہد۔

آزادی:

آزادی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ فرد کی جوابدہی کا پورا قرآنی فلسفہ اسی پر قائم ہے۔ عقل انسانوں اور دوسرے جانداروں کے درمیان مابہ الامتیاز ہے اور آزادی اس عقل کا لازمی تقاضا ہے۔ آزادی کے بغیر عقل کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی اور عقل کے بغیر انسانی زندگی کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی۔ فطرت چاہتی ہے کہ پوری انسانی دنیا آزادی کی چھاؤں میں آجائے اور پوری انسانی زندگی پر اسی کا رنگ غالب رہے۔ یقیناً بلاتفریق ملک وملت اور رنگ ونسل دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کے لیے رب کائنات کا یہ ایک عظیم عطیہ ہے۔

ماہرین مقاصد نے شریعت کے کلی مقاصد، دین، نفس، عقل، نسب اور مال کے علاوہ شریعت کے کلی مقاصد میں جو اضافے کیے ہیں، ان میں ایک اہم مقصد 'الحریۃ والعدل' یعنی آزادی اور عدل وانصاف بھی ہے۔(۷)

انسانی سماج میں بگاڑ اس وقت شروع ہوتا ہے جب فرد دوسروں پر اپنی سوچ اور فکر کو زور زبردستی نافذ کرنا چاہتا ہے یا پھر اپنی آزادی کا بے جا استعمال کرتے ہوئے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

انسانی سماج میں عدل کا قیام اور امن کی بازیافت اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ سماج میں ہر فرد کو ارادہ اور اختیار کی آزادی حاصل ہو۔ یہ آزادی اس کی ذاتی زندگی سے شروع ہو کر اس کی اجتماعی زندگی تک ایک ایک گوشے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کو اپنی انفرادی زندگی میں کب اور کیا فیصلہ لینا ہے اور اپنی اجتماعی زندگی میں کب اور کیا فیصلہ لینا ہے، یقیناً یہ آزادی فرد کا حق اور قرآن مجید کے فلسفۂ جوابدہی کا لازمی تقاضا ہے۔ قرآن مجید فرد کے اس حق کا کھلے طور پر اعتراف کرتا ہے۔

مذہب کے قبول وردّ کے سلسلے میں بھی فرد کو آزادی ہے اور مذہب کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں بھی۔ یہ آزادی صرف نظری سطح پر نہیں ہے بلکہ عملی سطح پر بھی ہے۔ کسی بھی انسان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ مذہب کے سلسلے میں کسی بھی فرد کے ساتھ زور زبردستی کا رویہ اختیار کرے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىَ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللّهُ سَمِيعٌ عَلِيم۔ (البقرۃ:۲۵۶)

قرآن مجید تبدیلی اور انقلاب کا بہت ہی فطری اور پرامن طریقہ اختیار کرتا ہے اور اس کی عملی مثال کے طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کی پوری جدوجہد کو پیش کرتا ہے۔

ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ (النحل:۱۲۵)

قرآن مجید کی نگاہ میں اسلام ہی واحد برحق مذہب ہے، اس کے باوجود تمام ہی مذاہب کے شعائر اور تمام ہی مذاہب کی عبادت گاہوں کا وہ احترام کرتا ہے اور ان کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانا اس کے نزدیک فساد فی الارض میں شامل ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيراً۔ (الحج:۴۰)

عدل وانصاف:

عدل وانصاف شریعت کے کلی اور بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ یہ انسان کے بنیادی حقوق سے آگے بڑھ کر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں داخل ہے۔ عدل وانصاف کا قیام عدل اجتماعی کے قیام کی بہت ہی اولین بنیادوں میں سے ہے۔ شریعت کی منشا ہے کہ اس دنیا میں عدل وانصاف قائم ہو، اور یہ عدل وانصاف ہر کسی کے لیے عام ہو اور ہر کسی کے لیے یقینی بنایا جائے، خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ کیونکہ جہاں عدل وانصاف نہیں ہوگا وہاں ظلم ہوگا، اور ظلم خواہ کسی کے ساتھ ہو اور کسی بھی شکل میں ہو، وہ اللہ رب العزت کو بالکل ہی ناپسند ہے۔

'العدل' اللہ رب العزت کے اسماء حسنی میں شامل ہے اور قرآن مجید میں اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی عظمت کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔ (الشوری:۱۵)

مسلم حکمرانوں اور اہل حل وعقد کو بہت ہی تاکید کے ساتھ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے منصب کا پورا پورا لحاظ رکھیں اور لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کریں:

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا

حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللّهَ كَانَ سَمِيعاً بَصِيراً۔ (النساء:۵۸)

عدل اہل اسلام کا لازمی وصف ہے، قرآن مجید میں اہل اسلام کو بار بار اس بات کی تلقین کی گئی کہ ان کا رویہ عدل وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے خواہ اس کی زد میں ان کا بڑے سے بڑا اور قیمتی سے قیمتی مفاد ہی کیوں نہ آجائے، بہرحال انہیں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے عدل وانصاف کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے، فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقِيْراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْراً۔ (النساء:۱۳۵)

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاء ذِيْ الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (النحل:۹۰)

مذکورہ بالا آیات میں ایک اہم چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں عدل وانصاف کی تلقین کی گئی ہے، کہیں بھی اس کو اہل اسلام کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو عام اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور شواہد بتاتے ہیں کہ تمام ہی انسانوں کے ساتھ اس کو لازمی قرار دیا گیا ہے، سورہ مائدہ کی آیت میں یہ چیز اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے، کہا گیا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل وانصاف کا راستہ چھوڑ بیٹھو، بلکہ صحیح اور مطلوب بات یہ ہے کہ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرو، یقیناً یہ تقوی کا تقاضا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْن۔ (المائدۃ:۸)

جب جب دنیا سے عدل وانصاف کا خاتمہ ہوتا ہے، ظلم اور استبداد کو اپنے پیر پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بات کہ سماج کے ایک مخصوص طبقے کے ساتھ عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا جائے اور ایک مخصوص طبقے کو اس سے محروم رکھا جائے، اور پھر اس بات کی امید کی جائے کہ سماج بحیثیت مجموعی فساد اور ظلم سے محفوظ رہ جائے گا، اس تصور کی اسلام جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اسلام انسان کو عظمت دیتا ہے، اس طور پر کہ وہ انسان ہے اور اسے بار بار انسانی عظمت کی پاسداری کی تلقین کرتا ہے، اور عام انسانی مسائل میں اس کے سلسلے میں جو بھی موقف اختیار کرتا ہے، وہ بحیثیت انسان اختیار کرتا ہے، مذہب کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان بنیادی انسانی مسائل کے سلسلے میں وہ کسی بھی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔

انسانی مساوات:

انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے اپنی نوع کے دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء وَاتَّقُواْ اللّهَ الَّذِيْ تَسَاءلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً۔ (النساء:۱)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيْمٌ خَبِيْر۔ (الحجرات:۱۳)

خالق کائنات نے اسے بحیثیت انسان جو عظمت بخشی ہے وہ اس کا برابر کا حصہ دار ہے۔ انسانی عظمت کا تقاضا ہے کہ اسے سماج میں بحیثیت انسان وہ سماجی مقام حاصل ہو جو سماج کے دوسرے انسانوں کو حاصل ہے۔ اسے قانون کی نگاہ میں وہ مقام حاصل ہو جو سماج کے دوسرے انسانوں کو حاصل ہے۔ اسے سماج میں وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں جو سماج کے دوسرے انسانوں کو حاصل ہیں۔ اس کے سامنے مواقع اور امکانات کی وہ پوری دنیا موجود ہو جو سماج کے دوسرے انسانوں کے سامنے موجود ہے۔ انسانی عظمت کا تقاضا ہے کہ اسے زندگی کے مختلف محاذوں پر آگے

بڑھنے اور اپنا جوہر دکھانے کے یکساں مواقع حاصل ہوں، خواہ وہ سیاسی محاذ ہو یا معاشی محاذ، تمدنی اور ثقافتی محاذ ہو، یا سماجی زندگی کے کسی بھی گوشے سے تعلق رکھنے والا محاذ ہو۔

سید قطب شہیدؒ نے اسلام کے تصور مساوات کی وسعت اور آفاقیت پر بہت ہی اچھی گفتگو کی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسلام زندگی کے ہر پہلو کو لیتا ہے۔ اجتماعی شعبوں کو بھی اور ضمیر و وجدان کے گوشوں کو بھی، اور ہر جگہ پوری پوری مساوات قائم کرتا ہے۔ ضمیر انسانی کو ہر طرح کی احتیاج، خالی خولی مظاہر اور مصنوعی سماجی اقدار کے دباؤ سے آزاد کر کے مساوات کو اصولی طور پر متحقق کر دینے کے بعد اس امر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اسلام الفاظ میں اور ظاہری شکلوں کی تعیین کے ساتھ بھی مساوات کا اعلان کرے۔ لیکن اس نے یہ بھی کیا، کیونکہ مساوات اسے بہت عزیز ہے۔ وہ اسے نسل وقبیلہ اور خاندان ومقام کی تنگیوں سے آزاد، مکمل انسانی شکل میں قائم دیکھنا چاہتا ہے کہ مغرب کے مادّہ پرست، سائنٹفک نظاموں کی طرح اس مساوات کا دائرہ صرف اقتصادی امور تک محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو۔''(۸)

شورائیت:

اسلام میں عدل اجتماعی کی ایک اہم بنیاد شورائیت بھی ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام شورائیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ اجتماعی نظام خواہ خاندان کی شکل میں ہو، یا سماج کی شکل میں ہو، یا حکومت اور اسٹیٹ کی شکل میں ہو۔ اسلام اجتماعی زندگی کے ان تمام اداروں کو شورائیت کی بنیاد پر آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ خاندان کی سطح پر ہونے والے فیصلے بھی شورائیت کے ذریعہ طے ہوں، معاشرے کی سطح پر ہونے والے فیصلے بھی شورائیت کے ذریعہ طے ہوں اور ریاست کی سطح پر ہونے والے فیصلے بھی شورائیت کے ذریعہ طے ہوں۔

قرآن مجید میں شورائیت کو مومنین کے بنیادی وصف کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ۔ (الشوریٰ:۳۶۔۳۹)

(پس جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے، وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائے دار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے، جو ایمان لائے ہیں اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں، جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے ربّ کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اُس کا مقابلہ کرتے ہیں۔)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی آپ کو کچھ مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ موجود افراد سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ غزوۂ احد کے سخت ترین حالات میں بھی اللہ کے رسول ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ وہ شورائیت سے کام لیں:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ۔ (آل عمران:۱۵۹)

یہی مزاج خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا بھی رہا، وہ اجتماعی امور باہم مشورے کے بعد ہی طے کیا کرتے تھے۔

اسلام کا نظام معاشرت اس وقت مختلف سطحوں پر جن بڑے چیلنجز سے دوچار ہے، ان میں سرفہرست امت کے اجتماعی اداروں میں شورائیت کی جگہ شخصی اور استبدادی مزاج اور ماحول کا فروغ ہے۔ یہ چیلنج خاندان کی سطح پر بھی مسائل کا سبب بن رہا ہے، اجتماعی یا

بالفاظِ دیگر افرادِ امت کے تعاون سے چلنے والے اداروں اور تنظیموں کے درمیان بھی مسائل کا سبب بن رہا ہے، اور معاشرے اور حکومت کی سطح پر بھی۔ فطری بات ہے کہ جہاں شورائیت کا فقدان ہوگا وہاں استبداد کا دور دورہ ہوگا، اور جہاں استبداد کا دور دورہ ہوگا وہاں نہ تو عدل اجتماعی ہوگا، اور نہ اجتماعی حقوق ہوں گے۔ وہاں علم وتحقیق اور حرکت وعمل کی جگہ جمود اور ٹھہراؤ ہوگا۔ نئی نئی دریافتوں اور نئے نئے انکشافات کے بجائے روایت پرستی اور دوسروں پر انحصار کا مزاج پروان چڑھے گا۔

اسلام نے خلافت کا تاج تمام انسانوں کو پہنایا ہے، اس خلافت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی امور باہم مشورے سے طے کریں۔ عقل اور آزادی کی نعمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے جبر واستبداد سے آزاد شورائی ماحول میں گزر بسر کریں۔ چنانچہ یہیں پر اسلام ملوکیت اور بادشاہت اور شخصی اور خاندانی حکومتوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ ملک کے عوام کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا حاکم اور فرماں روا منتخب کریں اور اپنے ملک کی سیاسی اور معاشی پالیسیوں کو آزادانہ بنیادوں پر طے کریں، ایسا نہ ہو کہ ملک کا نظام مخصوص افراد یا مخصوص خاندان کے درمیان گردش کرتا رہے اور برسر اقتدار فرد یا گروہ کو اعتماد میں لے کر امریکہ اور اسرائیل طے کریں کہ اس ملک کی سیاسی اور معاشی پالیسیاں کیا ہوں گی۔(۹)

اجتماعی تکافل باھمی:

اسلام میں عدل اجتماعی کی ایک اہم بنیاد 'اجتماعی تکافل باہمی' بھی ہے۔ اسلام فرد کے وجود کو بھی اہمیت دیتا ہے اور معاشرے کے وجود کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ وہ فرد کو جہاں بہت سے حقوق دیتا ہے وہیں اس پر بہت سے حقوق عائد بھی کرتا ہے۔ وہ جہاں فرد کو رزقِ خداوندی کی تلاش کے لیے کھلی آزادی اور کھلے مواقع فراہم کرتا ہے، وہیں اس کو سماج کے مجبور وپریشان اور ضرورت مند افراد پر انفاق کی ترغیب بھی دیتا ہے بلکہ بسا اوقات اسے اس کا دینی فریضہ بھی قرار دیتا ہے، سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بہت ہی مختصر جملے میں اس حقیقت سے صاف طور پر متنبہ کر دیا گیا، کہا گیا: وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ (البقرۃ:۲)، یعنی اللہ رب العزت نے بندوں کو جو کچھ رزق عنایت کیا، اس پر یقیناً ان کی ملکیت قائم ہوگئی، لیکن ساتھ ہی ان کے رویے کی بھی تعیین کر دی کہ متقین اور اللہ والے بندے صرف اپنی ملکیت میں اضافے کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اس رزق خداوندی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں۔ اجتماعی تکافل باہمی کا یہ معاملہ صرف معاشی اور مالی معاملات تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلام اس کو ایک اجتماعی وصف کے طور پر بندوں کے درمیان فروغ دینا چاہتا ہے۔ اسلام ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جس میں زندگی کے ہر محاذ پر افراد معاشرہ ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوں اور ایک دوسرے کے لیے خیر وبرکت کا سبب بنیں، سورہ التوبہ میں اس کو کچھ اس طور پر بیان کیا گیا:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَـئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّهُ إِنَّ اللّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (التوبہ:۷۱)

قرآن مجید ضرورت پڑنے پر تکافل باہمی کے مقصد کے تحت قتال تک کا حکم دیتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّاً وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيراً۔ (النساء:۷۵)

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں۔۔۔''

فساد فی الارض کے خلاف مشترکہ جدوجہد:

عدل اجتماعی کی ایک اہم بنیاد فساد فی الارض کے خلاف مشترکہ جدوجہد ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے اور اس زمین کو اللہ رب العزت

نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے، اور یہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے رہنے بسنے کے لیے واحد ٹھکانہ ہے۔ اللہ رب العزت کی اس نعمت کا تقاضا ہے کہ اس کا پورا پورا حق ادا کیا جائے، یعنی اس زمین اور اس زمین پر موجود اللہ رب العزت کی تمام نعمتوں کو صحیح طور سے استعمال کیا جائے۔ نیز اس زمین اور اس زمین پر موجود اللہ کی تمام نعمتوں کو ضائع ہونے یا فساد کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ یہ کچھ افراد کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس زمین پر رہنے بسنے والے تمام ہی انسانوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر محی الدین غازی نے فساد فی الارض کے قرآنی استعمالات کے تعلق سے کافی اہم اور فکر انگیز بات لکھی ہے، لکھتے ہیں:

''قرآن مجید مختلف اعمال اور رویوں کے لیے فساد فی الارض کا فقرہ استعمال کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اس فقرہ کا بکثرت استعمال اسے ایک قرآنی اصطلاح کا درجہ دے دیتا ہے۔ یہ اصطلاح بڑی معنی خیز ہے۔ یہ زمین انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے اور تا قیامت پیدا ہونے والے انسانوں کا واحد ٹھکانہ ہے، اگر کسی فرد یا گروہ کا رویہ اس ٹھکانے کو نقصان پہنچانے یا برباد کرنے کا سبب بنتا ہے تو اس کے خلاف سارے انسانوں کا اٹھ کھڑا ہونا عین تقاضائے عقل وفطرت ہے۔ کسی برائی کو فساد فی الارض کہہ کر قرآن مجید اس مسئلہ کو انسانوں کا ذاتی مسئلہ بنا دیتا ہے، کہ اسے حل کرنے کی ذمہ داری انہیں خود آگے بڑھ کر قبول کرنا چاہیے، کسی عمل کے فساد فی الارض ثابت ہوجانے کے بعد اس کے خلاف احتجاج ہر فرد کے اندر پیدا ہوجانا عین متوقع ہے، ماسوا اس کے جس کا اپنا مفاد اس فساد سے وابستہ ہو چکا ہو۔

یوں تو فساد فی الارض کا اطلاق ان ساری برائیوں پر ہوتا ہے جن کا ارتکاب کرۂ ارض پر کیا جائے، لیکن قرآن مجید کے استعمالات بتاتے ہیں کہ معاشی انحراف اور مالی جرائم سے اس لفظ کا گہرا تعلق ہے۔ غالباً اس لیے کہ زمین ان وسائل کا مخزن ومنبع ہے جن پر انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہے''۔(۱۰)

فساد فی الارض کی مختلف صورتیں اور مختلف درجات ہوسکتے ہیں، یہ کم درجے کا بھی ہوسکتا ہے اور بڑے درجے کا بھی ہوسکتا ہے۔ چھوٹی سطح پر بھی اس کا ارتکاب ہوسکتا ہے اور بڑی سطح پر بھی اس کا ارتکاب ممکن ہے، ہر دو صورت میں اس کا مقابلہ کرنا اس کائنات میں عدل اجتماعی کے قیام کا بنیادی تقاضا ہے۔

حوالہ جات

(۱) اسلام اور عدل اجتماعی، سید ابوالاعلی مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ستمبر ۱۹۹۴ء صفحہ ۸۔۹

(۲) اسلام اور عدل اجتماعی: صفحہ: ۱۳

(۳) اسلام اور عدل اجتماعی: صفحہ: ۱۳۔۱۴

(۴) العدالۃ الاجتماعیہ، سید قطب، اردو ترجمہ: نجات اللہ صدیقی، 'اسلام میں عدل اجتماعی'، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۴ء

(۵) اسلام اور عدل اجتماعی

(۶) الاسلام وحقوق الانسان۔ ضرورات لاحقوق، ڈاکٹر محمد عمارہ، عالم المعرفۃ، ۱۹۸۵۔ الاسلام والامن الاجتماعی، دار الشروق، ۱۹۹۸

(۷) دیکھیں: مقاصد الشریعہ، علامہ طاہر ابن عاشور

(۸) اسلام میں عدل اجتماعی، سید قطب، صفحہ ۱۳۳/۱۳۴

(۹) شورائیت کے تعلق سے اسلام کے موقف پر ڈاکٹر محی الدین غازی، ڈین فیکلٹی آف قرآن الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلا نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں بہت ہی شاندار گفتگو کی ہے، ملاحظہ ہو: امت کے فیصلے امت کے مشورے سے، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، پاکستان، ماہ فروری۔ ماہ مارچ ۲۰۱۷ء

(۱۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار)، فساد فی الارض کا مالی اور معاشی پہلو، ڈاکٹر محی الدین غازی، صفحہ ۸۴/تا ۱۰۱/، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ ۲۰۱۱ء

☆☆☆

تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

آپ جنس سے متعلق بچے سے کیا کہیں؟

نوٹ: یہاں بعض باتیں حذف کر دی گئی ہیں جو کتاب کی اشاعت کے وقت شامل کر لی جائیں گی۔

یہاں اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب و پاخانہ کے متعلق بھی موقف ایجابی ہونا چاہیے، بچے کو بالکل بھی اس کا احساس نہ دلانا چاہیے کہ پیشاب پاخانہ کرنے کا عمل اپنے آپ میں کوئی قبیح عمل ہے، اس کی صفائی پر توجہ اور اہتمام اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ میں برا عمل ہے بلکہ چونکہ غلاظت کے ساتھ جراثیم ہوتے ہیں اس لئے اس کی صفائی پر توجہ دی جاتی ہے، اس طرح بچہ سیکھے گا کہ اس کو پیشاب پاخانے کے عمل میں شرمانا نہیں چاہیے۔

عام طور سے تین سے چھ سال کی عمر میں بچہ اپنے جنسی اعضاء کو چھونے لگتا ہے، کیوں کہ اس مرحلہ میں اس کے جسم کے یہ اعضاء ابھرنے لگتے ہیں، بلکہ ان کو چھونے سے اس کو کچھ لذت بھی ملتی ہے، اسی لیے کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کپڑے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس سے کھیلتا بھی ہے، بلکہ بسا اوقات یہ کام وہ اس پر توجہ دیے بغیر کرتا ہے، عقل اس کی کسی اور چیز میں مشغول ہوتی ہے مگر وہ یہ کام کر رہا ہوتا ہے، اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، یہ بات بچے اور بچیاں دونوں کے یہاں پائی جاتی ہے، بہت سے والدین جب بچوں کو ایسا عمل کرتے دیکھتے ہیں تو سخت ناراض ہوتے ہیں اور اکثر چیختے ہیں اور اس کو روکتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کرے، کبھی کبھی اس کے ہاتھ پر مار دیتے ہیں، یا اس کا ہاتھ کھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں، بسا اوقات اس کو کسی سزا سے ڈراتے ہیں، مثلا کہتے ہیں کہ اگر اب تم نے ایسا کیا تو اس عضو کو جلا دیں گے، والدین کے اس ردعمل سے یقیناً بچہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی بڑا خطرناک کام کر رہا ہے، یا کوئی گناہ اور معیوب کام کر رہا ہے، لیکن غالب گمان یہی ہے کہ وہ دوبارہ پھر یہی کرے گا کیوں کہ اس کو اس میں کچھ لذت ملتی ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ گھر والے اس کو ایسا کرنے سے کیوں روک رہے ہیں، وہ سوچتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے اپنی ناک اپنے کان وغیرہ چھو سکتا ہے، مگر کیا وجہ ہے کہ وہ کپڑوں کے نیچے کے اعضاء کو نہیں چھو سکتا، کبھی کبھی بچے کو یہ خیال بھی جکڑ لیتا ہے کہ شاید وہ اچھا اور صاف بچہ نہیں ہے کیوں وہ ان اعضاء کو چھوتا ہے۔ مزید اگر بچہ کچھ معلوم کرتا ہے تو اسے یا تو ڈانٹا جاتا ہے، جھڑک دیا جاتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اچھا کام نہیں، گندا عمل ہے، جبکہ بچہ اس کام کو اچھا اور متلذذ کام سمجھتا ہے۔

اس سلسلے میں افضل یہ ہے کہ اہل خانہ اس عمل سے چشم پوشی برتیں، اس لیے کہ بچہ اس مرحلے میں اپنے جسم کی کیفیت سے واقف ہو رہا ہوتا ہے اور جلد ہی یہ مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔

بچے کے اس طرح اپنے عضو خاص کو چھونے اور کھیلنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں جنسی احساس ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا ہے، یا اس میں اخلاقی انحراف کی ابتدا ہو رہی ہے، البتہ والدین کو اس پر

غور کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ جب بچہ کسی پریشانی میں ہو، اس کو کسی مشکل کا سامنا ہو تبھی وہ اپنے سکون واطمینان کے لیے ایسا کرتا ہو، یا جب اہل خانہ اس پر کسی وجہ سے غصہ ہوتے ہوں تب وہ ایسا کرتا ہو، اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہی چھوکر قلبی سکون حاصل کرتا ہے، اس سے باز رکھنے کے لیے والدین کو اسے بہتر اور خوشگوار گفتگو کا ماحول فراہم کرنا چاہیے، اور دوسرے طریقے سے اس کی مشکلات کو حل کرنے کی فکر کرنا چاہیے، اگر ایسا ہے تو یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ بچے کو نفسیاتی اور جسمانی دونوں لحاظ سے مزید رعایت، محبت اور نرمی وعنایت درکار ہے۔

والدین سے یہ مخفی نہیں ہے کہ بلوغ کے وقت بچے اور بچی کے جسم میں جو تغیرات ہوتے ہیں انھیں ان تغیرات سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنا پڑتا ہے، خواہ وہ تغیرات نفسیاتی ہوں یا عام جسمانی نوعیت کی تبدیلیاں ہوں جیسے ثدیین کا بڑھنا، آواز میں مرحلہ وار تبدیلی پیدا ہونا، یا بلوغ کے وقت موئے زیر ناف کا بڑھنا، یا لڑکوں کو احتلام ہونا اور لڑکیوں کو ماہواری شروع ہونا، بعض لوگ بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ ان موضوعات پر مائیں لڑکیوں سے اور باپ لڑکوں سے بات کریں، بہرحال اگر پورے سکون واطمینان سے بغیر کسی سختی اور شدت کے بات کی جائے تو بہت مفید ہوتی ہے۔ (اس کی مزید تفصیل عنفوان شباب سے متعلق بحث میں آئے گی)۔

بچوں کے درمیان جنسی کھیل

جس طرح بچے کو اپنے جسم کے اعضاء کو جاننے کی طلب ہوتی ہے اسی طرح وہ دوسروں کے اعضائے جسمانی کی بھی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی لیے جب وہ دوسرے بچے کا جسم دیکھتا ہے تو اس کے جسم کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر بچے طبیب ومریض جیسا کھیل کھیلتے ہیں، ان کو کھیل کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا یہ طبعی بات ہے کہ ڈاکٹر مریض کا جسم چیک کرے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس قسم کے کھیلوں میں بچے مبالغہ کریں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے کھیلوں میں وہ جنسی طور پر متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اکثر بچے اس طرح کے کھیل سے اپنی فہم کے بقدر معلومات حاصل کرنے کے بعد اکتا جاتے ہیں، البتہ یہ کھیل ان گھرانوں میں کم پایا جاتا ہے جن میں بچوں کو جنسی امور کے متعلق کچھ باتیں بتائی جاتی ہیں، اسی طرح ان گھرانوں میں بھی کم پایا جاتا ہے، جہاں شرم وحیا کو ملحوظ رکھنے اور ستر کو ڈھکنے کے ساتھ ساتھ انسانی جسم کو باعث عار نہیں سمجھا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ والدین اس وقت کیا کریں جب اپنے بچوں کو دیکھیں کہ وہ کسی کے جسم کی طرف دیکھ رہے ہیں یا اس طرح کے کھیل، کھیل رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان کو کسی صدمہ کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بچہ نمو کے مرحلہ سے گزر رہا ہے، بعض لوگ یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ بچوں پر ایسے موقع پر سختی کر کے انھیں یہ نہ جتلائیں کہ اس طرح کی معلومات حاصل کرنے کا شوق اپنے آپ میں ایک معیوب عمل ہے، اچھی بات یہ ہے کہ نرمی اور سکون کے ساتھ بچے سے کہا جائے ''چلو اب تم لوگ جو دیکھنا تھا دیکھ چکے، آؤ چلو اب فلاں کام کرتے ہیں''۔

اس طرح آپ بغیر کوئی پیچیدگی پیدا کیے انھیں اس عمل سے روک دیں گے، اس طرز عمل سے یہ بھی نہیں ہوگا کہ آئندہ وہ آپ سے چھپا کر یہ کام کریں، ساتھ ہی آپ انھیں ان ''ممنوعات'' و محرمات'' کے سلسلے میں سوچنے کا بھی موقع دیں گے۔

یہ بھی فطری عمل ہوتا ہے کہ بڑھتی عمر اور جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ بچے میں تنہائی یا دوسروں کے سامنے اپنا ستر نہ کھولنے کا شعور پیدا ہو، اپنے بھائی بہنوں سے چھپانے کا مزاج پیدا ہو، اکثر یہ مزاج ۵ سے ۷ سال کی عمر کے درمیان پیدا ہوتا ہے، جب بچے میں یہ شعور پیدا ہونا شروع ہو تو ضروری ہے کہ دوسروں سے پہلے خود والدین اس کا احترام کریں، اور اس پر بچے کی حوصلہ افزائی کریں، یہ شعور حیا

کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے حتی کہ دس سال کی عمر میں کمال کو پہنچ جاتا ہے، اس عمر میں پہنچ کر اکثر بچے اپنے ستر کو دوسروں سے مخفی رکھنا پسند کرتے ہیں۔

یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب والدین بچے کو بالخصوص اپنے سے بڑے کے ساتھ اس طرح کا ''جنسی کھیل'' کرتے دیکھیں تو پریشان ہوں، اس کا بہتر علاج یہ ہے کہ وہ بچے کو ابتدائی عمر میں یہ سکھائیں اور بتائیں کہ یہ جسم صرف اور صرف تمہاری ملکیت ہے، کسی کو اسے چھونے کی اجازت نہیں دینا چاہیے سوائے (والدین کے جبکہ وہ نہلانے اور صفائی ستھرائی کے لئے چھوئیں) تم سے اگر کوئی تمہارے جسم کو چھونے یا کپڑے ہٹانے کو کہے تو فورا منع کر دینا چاہیے۔

اور پھر والدین کو بھی متنبہ رہنا چاہیے بالخصوص جب بچہ دوسروں کے ساتھ اور اپنے سے بڑوں کے ساتھ کھیلے تو انھیں خاص خیال رکھنا چاہیے، لیکن اس طرح کہ دوسرے لوگوں کو کوئی شک نہ ہو سکے، اور نہ کسی طرح کی پیچیدگی و پریشانی پیدا ہو، اگر بچہ نظروں سے دور کسی جگہ کھیلنا چاہے مثلا کسی ایسے کمرے میں جو نظروں سے اوٹ ہو تو آواز دے کر کہنا چاہیے کہ یہاں آ کر ہمارے سامنے کھیلے مگر یہ کہتے ہوئے بھی کسی طرح کا شک نہ پیدا ہونا چاہیے۔

حیا اور ستر عورت:

احترام نفس اور قبول ذات کے لئے ضروری ہے کہ بچے کو اپنے جسم کا شعور ہو، اور اپنے جسم کے تئیں اس کا ایک موقف ہو، شرم وحیا اور ستر عورت سے متعلق معلومات حاصل ہوتے ہوئے وہ یہ بھی سیکھ لے گا کہ جسم کے بعض اعضا ایسے ہیں جن کو وہ دوسروں کے دیکھنے کے لئے نہیں کھول سکتا، الا یہ کہ کوئی خاص حالت پیش آئے، جیسے والدین کے سامنے غسل وغیرہ کے لیے یا طبیب کے سامنے کھولنا پڑے، اس کو اسی دوران یہ سکھانا چاہیے کہ جسم اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، جس کی تخلیق اس نے کی ہے اور اچھی کی ہے الذی خلقك فسواك فعدلك (انفطار:۷) اس کو یہ بتانا چاہیے کہ جسم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو معیوب یا گندی ونجس ہو۔

اگر بچہ ایسا ہو کہ وہ ہر وقت اپنا پورا جسم ڈھکنا پسند کرتا ہو حتی کہ گھر میں بھی یہی کرتا ہو تو اسے بتانا چاہیے کہ ہر وقت مکمل طور پر جسم کو بند کرنا ضروری نہیں ہے، اگر ایسا ہو کہ آنے جانے والوں اور مہمان کے سامنے کپڑے اتار دیتا ہو، تو اس سے یہ کہا جائے کہ لوگ دوسروں کو بغیر کپڑوں کے دیکھنا پسند نہیں کرتے، بلکہ جسم کے کچھ خاص حصے ایسے ہوتے ہیں جنھیں انسان کو دوسروں کے احترام اور خود اپنی تکریم وشرافت کے لئے چھپانا چاہیے۔

ان دونوں میں سے اگر بچہ کسی بھی ایک رجحان پر شدت سے عمل کر رہا ہو تو پھر کسی نئی مشکل کو جنم نہیں دینا چاہیے، کیوں کہ غالب گمان یہی ہے کہ وہ اس مرحلے سے گزر جائے گا، لوگوں سے اختلاط اور آداب جسم، آداب ستر اور آداب ملاقات ومعاشرت کے متعلق اطمینان سے دی جانے والی تعلیمات وتوجیہات کے نتیجے میں یہ رجحان خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اگر کبھی بچہ والدین کے سامنے اچانک برہنہ چلا جائے تو والدین کو کسی بڑی تکلیف ومصیبت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، ورنہ بچہ دوسروں کو پریشان کرنے کا ایک نیا ہنر والدین کے ردعمل کی بنا پر سیکھ لے گا، اور پھر اس طریقے سے لوگوں کو غصہ دلائے گا، اس کے بجائے اگر والدین اطمینان وسکون سے بغیر کسی اضطرابی کیفیت کے اس کے ساتھ پیش آئیں گے تو فطری طور پر یہ قضیہ ختم ہو جائے گا اور بآسانی بچہ بہتر ومقبول طرز تعامل اور حسن سلوک سیکھ لے گا۔

ہمارے دین میں جنسی تربیت سے متعلق بہترین رہنمائیاں ہیں، ان کو پڑھنے کے لئے علامہ عبداللہ ناصح علوان کی ''تربیۃ الأولاد فی الإسلام'' اور علامہ یوسف القرضاوی کی کتاب ''الحلال والحرام فی الاسلام'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆

❑ سلگتے مسائل

طلاقِ ثلاثہ کے بعد حلالہ پر ہنگامہ

سید احمد ومیض ندوی
استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

شریعت میں مداخلت کا سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے، یکے بعد دیگرے شرعی قوانین حکومت کے نشانے پر آتے جارہے ہیں، یہ دراصل اسلام کے نظامِ خاندان پر حملوں کے تسلسل کے ساتھ مسلم پرسنل لاء کو ٹھکانے لگانے کی سوچی سمجھی سازش ہے، طلاقِ ثلاثہ بل کے خلاف ابھی احتجاج کا سلسلہ تھما نہیں تھا کہ حلالہ اور تعددِ ازواج کے خلاف عدالتی کارروائی شروع ہوگئی، ۶ر دسمبر ۲۰۱۶ء کو جس اشونی کمار اپادھیائے کو ایک عرضی داخل کرنے پر سپریم کورٹ نے پھٹکار لگائی تھی اور اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کیا آپ سپریم کورٹ میں بی جے پی کے لیے مہم چلارہے ہیں؟ کیا آپ کی پارٹی نے آپ کو سپریم کورٹ میں درخواست دینے کا کام سونپ رکھا ہے؟ اسی اشونی کمار کی طرف سے سپریم کورٹ میں حلالہ اور تعددِ ازواج کے خلاف مفادِ عامہ کی عرضی داخل کی گئی ہے، اشونی کمار کے علاوہ اس تعلق سے داخل کی گئی مزید چار درخواستوں کی سماعت کرتے ہوئے گذشتہ دنوں سپریم کورٹ نے اشارہ دیا ہے کہ وہ حلالہ اور تعدد ازواج کے آئینی جواز کا جائزہ لے گی، اشونی کمار بی جے پی کے دہلی پردیش کے ترجمان اور سپریم کورٹ میں وکیل ہیں، ان کے علاوہ ثمینہ، نفیسہ خان، معلم اور محسن بن حسین نے بھی سپریم کورٹ میں عرضی داخل کی ہے، مفادِ عامہ کی ان درخواستوں میں تعدد ازواج، حلالہ، متعہ اور نکاحِ مسیار کو غیر آئینی قرار دئے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، درخواست گذاروں کا کہنا ہے کہ مسلم پرسنل لاء (شریعت) درخواست ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ کو آئین کے آرٹیکل ۱۴، ۱۵، ۲۱ اور ۲۵ کی خلاف ورزی کرنے والا قرار دیا جائے، تعزیراتِ ہند کے ۶۰ ۱۸ کے التزام تمام ہندوستانی شہریوں پر یکساں طور سے لاگو ہوں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاقِ ثلاثہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۴۹۸ اے کے تحت ایک ظلم ہے، حلالہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۵ کے تحت عصمت دری اور تعدد ازواج تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے تحت ایک جرم ہے، گذشتہ ماہ مارچ کو سپریم کورٹ نے ان درخواستوں پر سماعت کرتے ہوئے مرکزی حکومت، وزارت قانون، خواتین اور بچوں کی فلاح وبہبود کی وزارت اور تمام فریقوں سے جواب طلب کیا ہے، سپریم کورٹ نے اس معاملہ کو وسیع تر آئینی بینچ کے حوالے بھی کردیا ہے، جو اس کی تفصیلی سماعت کے بعد یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا تعدد ازواج اور حلالہ بھی طلاقِ ثلاثہ کی طرح غیر قانونی ہیں، طلاقِ ثلاثہ کے معاملے کو بھی عدالتِ عظمیٰ نے وسیع تر آئینی بینچ کے حوالے کیا تھا؛ اگرچہ حلالہ اور تعدد ازواج کا مسئلہ اس وقت بھی زیر بحث آیا تھا؛ لیکن پانچ رکنی آئینی بینچ نے اس کی وضاحت کی تھی کہ وہ فی الوقت صرف طلاق ثلاثہ کی آئینی موزونیت کی سماعت کرے گی اور حلالہ اور تعدد ازواج پر فی الوقت غور نہیں کیا جائے گا، مسئلہ کی سماعت کے بعد آخر کار آئینی بینچ نے اپنا فیصلہ سنایا تھا، پھر مرکزی حکومت نے اس سلسلہ میں قانون سازی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مسلم خواتین بل ۲۰۱۷ء کے عنوان سے ایک بل متعارف کروا کر اسے لوک سبھا میں منظور بھی کرایا تھا، مسلم خواتین کے مفاد اور ان کے حقوق کے تحفظ کے نام سے بنایا گیا یہ بل نہ صرف شریعتِ اسلامی کے صریح خلاف اور مسلم

خواتین کے ساتھ ظلم ہے؛ بلکہ ملک کے ماہرین قانون نے بھی اس سے عدم اتفاق کیا ہے، جس مسلم خواتین بل کے لیے حکومت ملک کی تمام مسلم خواتین کی تائید کے حصول کا دعویٰ کررہی ہے آج پورے ملک کی مسلم عورتیں اس بل کے خلاف سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں، کولکاتہ سے لے کر ممبئی تک لاکھوں مسلم خواتین اس بل کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں حصہ لے رہی ہیں۔

جہاں تک حلالہ کا تعلق ہے تو اس کے خلاف جو کچھ طوفان برپا ہے اس کی بنیاد غلطی فہمی یا معاشرے میں رائج حلالہ کی گھناؤنی شکل ہے؛ ورنہ قرآن وسنت میں حلالہ کی جو تفصیل ذکر کی گئی ہے وہ مسلم سماج میں کثرت طلاق پر روک لگانے کا ذریعہ ہے، حلالہ کے خلاف طوفان کھڑا کرنے والوں کی اکثریت اس قرآنی حکم کی اصل حقیقت سے نابلد ہے، حلالہ کی مشروعیت جس تناظر میں ہوئی ہے، پہلے اس کی جانکاری ضروری ہے، اسلام سے قبل دور جاہلیت میں طلاق کی کوئی تحدید نہیں تھی، شوہر اپنی بیوی کو جتنی چاہتا طلاق دیتا اور پھر رجوع کرلیتا تھا، بہت سے مرد اپنی بیویوں کو مستقل اذیت میں مبتلا رکھنے کے لیے بار بار طلاق دیتے اور بار بار رجوع کرلیتے تھے، بیوی کو نہ ہی مکمل علیحدہ کرکے آزاد کیا جاتا اور نہ ہی اسے سکون کے ساتھ زوجیت میں رہنے دیا جاتا، اسلام کے ابتدائی دور میں بھی یہی سلسلہ تھا، اس دوران ایک صحابی کا واقعہ پیش آیا، انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تمہیں لٹکا کر رکھوں گا، بیوی نے پوچھا وہ کیسے؟ انھوں نے کہا تمہیں طلاق دوں گا، پھر عدت سے پہلے رجوع کرلوں گا اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھوں گا، خاتون نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر اپنے شوہر کی شکایت کردی، جس پر الطلاق مرتان الخ والی آیت نازل ہوئی، جس میں طلاق کی تحدید کردی گئی اور یہ واضح کردیا گیا کہ شدید ضرورت پر ایک طلاق دو، اس کے بعد مزید ایک اور طلاق دے سکتے ہو؛ لیکن تمہیں دو سے زائد طلاق نہیں دینی چاہیے، اگر تیسری طلاق دوگے تو پھر بیوی سے محروم ہوجاؤگے، اب اس بیوی سے نکاح کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی، عدت کے بعد نہ شوہر کا بیوی پر کا کوئی حق رہے گا اور نہ شوہر بیوی پر ظلم کرسکے گا، بیوی کے لیے اب کوئی رکاوٹ نہیں کہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے اور اسی کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہے، اتفاق سے اگر دوسرے شوہر نے طلاق دیدی یا اس کا انتقال ہوجائے تو عدت کے بعد عورت پھر آزاد ہوگی، چاہے تو وہ پہلے مرد سے شادی کرے یا کسی تیسرے مرد کے نکاح میں آجائے، آیت بالا میں یہی مضمون ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کو شریعت میں حلالہ کہا جاتا ہے، اب کوئی بتائے کہ آخر اس میں کون سی بات غلط ہے؟ حلالہ کا معاملہ شریعت اسلامی میں نہایت سادہ ہے، اس میں عورت کی عزت نفس کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ دراصل طلاق پر روک لگانے کا مؤثر ذریعہ ہے، قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ حلالہ پر پابندی عائد کرنا دراصل خواتین کے ساتھ زیادتی اور ان کے بنیادی حقوق کی پامالی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض مسلمان حلالہ کا غلط استعمال کرتے ہیں، ایسے لوگ شریعت کی نگاہ میں قابل مذمت ہیں، مثلاً بہت سے نادان لوگ جو غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے جاتے ہیں، پھر جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہوچکی ہے تو کسی ایسے آدمی کو تلاش کرتے ہیں جو ان کی بیوی سے ظاہری طور پر نکاح کرکے اسے طلاق دیدے؛ تاکہ وہ اس سے دوبارہ نکاح کرسکیں، یہ سراسر غیر اخلاقی اور انتہائی گھناؤنی حرکت ہے، نبی رحمت ﷺ نے اس کی سخت مذمت فرمائی ہے، ایسے شخص کو جو حلالہ کی خاطر نکاح کرے سانڈ سے تشبیہ دی ہے، نیز نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ حلالہ کی خاطر نکاح کرنے والے اور جس کے لیے ایسا نکاح کیا گیا دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حلالہ کے ناقدین بعض بے دین مسلمانوں کی جانب سے ہونے والے حلالہ کے غلط استعمال کو بنیاد بناتے ہیں؛ جب کہ انہیں اس قرآنی حکم کو قرآنی تناظر میں دیکھنا چاہیے، حلالہ کوئی لازمی حکم نہیں ہے؛ بلکہ پہلی بیوی کی گھر واپسی کی ایک اتفاقی شکل ہے، علامہ ابن عاشور نے حلالہ کی حکمتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بہت

خوب لکھا ہے وہ لکھتے ہیں: ''اس عظیم قانون کی حکمت یہ ہے کہ اس میں بیویوں کے حقوق کی پامالی اور گھروں میں انہیں کھلواڑ بنا لینے پر شوہروں کو زجر وتوبیخ کی گئی ہے؛ چنانچہ پہلی طلاق کو نادانی، دوسری کو تجربہ اور تیسری کو جدائی قرار دیا گیا ہے، پھر تیسری طلاق کے ساتھ دو حکم متعلق کئے ہیں، ایک یہ کہ شوہر سے مراجعت کا حق چھین لیا گیا، دوسرے یہ کہ بیوی کو بغیر دوسرے مرد سے نکاح کے پہلے شوہر کے پاس واپسی کے حق سے محروم کر دیا گیا، پھر دوسرے شوہر سے نکاح کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ تاکہ شوہروں کو اس بات سے روکا جائے کہ وہ تین طلاق دینے میں جلد بازی سے کام نہ لیں؛ ورنہ بیوی سے محروم کردئے جائیں گے'' (تفسیر التحریر والتنویر)۔ الغرض حلالہ کے ذریعہ عورتوں کے حقوق پامال کرنے والے شوہروں کو مشقت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان کی غیرت کو للکارا جاتا ہے کہ تمہاری بیوی جس کے ساتھ تم نے ایک عرصہ گذارا، تمہاری غلطی کے نتیجہ میں اب دوسرے کے بستر کی زینت بننے جارہی ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ حلالہ کے حوالہ سے حقائق پر کم اور پروپیگنڈہ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، عام لوگ اس سلسلہ میں میڈیا کے ذریعہ پھیلائے گئے پروپیگنڈہ پر یقین کرتے ہیں، ٹی وی چینلوں پر تو حلالہ کے سلسلہ میں اسی وقت سے ڈیبٹس کا سلسلہ چل رہا ہے، جب طلاق ثلاثہ کے خلاف کاروائی کا آغاز ہوا تھا، اب جب کہ عدالت نے دوبارہ اس مسئلہ کو زندہ کر دیا ہے، ملک کے ایک معروف ٹی وی چینل نے حلالہ کے خلاف ایک سیریل ہی بناڈالا ہے، جو گذشتہ کئی دنوں سے دکھایا جارہا ہے، عشق سبحان اللہ کے نام سے بنائے گئے اس سیریل میں مسلم خواتین کی خود ساختہ بے بسی کا رونا روتے ہوئے شریعت کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حلالہ کا قرآن وحدیث سے ثبوت نہیں ہے، حلالہ کے تعلق سے سب سے زیادہ جس بات کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شریعت کا ایک ناگزیر حکم ہے، جس سے ہر طلاق یافتہ مسلم خاتون کو بہر حال گزرنا پڑتا ہے؛ جب کہ یہ بات سراسر غلط ہے، حلالہ شریعت کا کوئی لازمی حکم نہیں ہے؛ بلکہ شرعی حلالہ کی حقیقت بس اتنی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں بیوی شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی ہے، اب اگر دونوں میاں بیوی دوبارہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا چاہیں تو اس صورت میں ہوسکتے ہیں جب اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شوہر سے ہوجائے، پھر وہ شخص اسے اتفاقاً طلاق دیدے یا اس کی موت واقع ہوجائے، تب عدت گزرنے کے بعد سابقہ میاں بیوی کے درمیان پھر سے نکاح ہوسکتا ہے، دوسرے شوہر کی طرف سے طلاق اتفاقاً ہونا چاہیے، نہ کہ پیشگی شرط کے ذریعہ، شریعت حلالہ کی اس صورت کو جس میں دوسرے شوہر سے نکاح طلاق کی شرط پر کیا جاتا ہے انتہائی قابل مذمت قرار دیتی ہے، ایک شخص حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آیا اور اس نے ابن عمرؓ سے ایسے آدمی سے متعلق سوال کیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اس کے بھائی نے اپنے بھائی سے مشورہ کئے بغیر اس عورت سے اس نیت سے نکاح کرلیا کہ وہ عورت اس کے بھائی کے لیے حلال ہوجائے تو کیا وہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی؟ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا: نکاح تو وہ ہے جو رغبت سے کیا جائے، ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس کو زنا سمجھتے تھے (المستدرک للحاکم ۲/۲۱۷)۔ اسی طرح کتب فقہ میں حلالہ کے تعلق سے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ حلالہ کرنے والے مرد وعورت اگر چہ ۲۰ رسال تک ایک ساتھ رہیں وہ زنا ہی کرتے رہیں گے (المغنی لابن قدامہ)۔ حلالہ کرنے والوں کے تعلق سے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کروانے والا لایا گیا تو میں دونوں کو سنگسار کردوں گا (مصنف عبدالرزاق)۔ برصغیر ہند وپاک کے معروف مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے حلالہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں شرعی حلالہ کی توضیح کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت چشم کشا ہے، حضرت لکھتے ہیں: ''یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہوگیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا اور چونکہ اس

نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلاوجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہوکر آپس میں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ عورت عدت طلاق پوری کرکے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کرکے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہوسکتا ہے (معارف القرآن ۱/۵۵۸)۔ شرعی حلالہ جس کی توضیح سطور بالا میں کی گئی ہے مختلف مصالح پر مبنی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے دوسرے شخص سے نکاح کی تین حکمتیں بیان فرمائی ہیں: (۱) اس بات کا اعلان کہ اب شوہر کا حق مکمل طور پر ختم ہوچکا ہے۔ (۲) شوہر کی فعل شنیع پر تعزیر وتشنیع۔ (۳) طلاق ثلاثہ کی سنگینی کا اظہار (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۳۹)۔

اب جب کہ سپریم کورٹ نے حلالہ کے آئینی جواز کا جائزہ لینے کا تہیہ کرلیا ہے اور اس سلسلہ کی کاروائی شروع کردی ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو انتہائی دوراندیشی کا مظاہرہ کرنا ہوگا، جہاں تک مروجہ غیر شرعی حلالہ (جس میں طلاق کی شرط لگائی جاتی ہے) کے ممنوع اور ناپسندیدہ ہونے کی بات ہے تو اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے؛ لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو نکاح ہوگا یا نہیں، اس میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن قدامہ کی تصریح کے مطابق امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے یہاں ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور مطلقہ خاتون اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی، ائمہ احناف میں امام ابو یوسف نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے؛ جب کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے؛ لیکن ان کے یہاں نکاح منعقد ہوجاتا ہے، ہندوستان میں اگرچہ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر فتویٰ دیا جاتا ہے؛ لیکن موجودہ حالات کے مدنظر کیا ان علماء کی تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے، جس میں انھوں نے امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے مسلک کو اپنانے کی رائے دی ہے؟ علماء کو جائزہ لینا چاہیے۔

طلاقِ ثلاثہ بل کے فوری بعد حلالہ اور تعدد ازواج کے مسئلے کو جس انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت ہورہا ہے، عدالت نے اس مسئلے کو سماعت کے لیے جس طرح پانچ رکنی آئینی بینچ کے پاس بھیج دیا ہے، اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عدالت پہلے سے تیار تھی، حکومت جانتی ہے کہ مسلم پرسنل لاء کو یکبارگی ختم کردینا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لیے وہ بتدریج مسلم پرسنل لاء کی دفعات اور اس کی مختلف شقوں کو بے اثر کرنا چاہتی ہے؛ تاکہ خود بخود مسلم پرسنل لاء ختم ہوجائے، شریعت میں مداخلت کے لیے اس نے آسان راستہ ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ عدالت کا سہارا ہے، اس کے لیے پہلے کچھ شخصیتوں کے ذریعہ عرضی داخل کروائی گئی، عرضی داخل کرنے والی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جس سے ان مسائل کا راست کوئی تعلق ہو، اس سلسلہ میں دہلی پردیش کے بی جے پی ترجمان اشونی کمار نے جو اس حوالے سے عدالتِ عظمیٰ کی پھٹکار بھی سن چکے ہیں پہل کی ہے، سوال یہ ہے کہ اشونی کمار کو آخر عدالت میں ان مسائل پر چیلنج کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ تعدد ازواج کے معاملہ میں آئینی جواز کی بات کرنے والی ان خواتین نے لیو اِن ریلشن شپ کے قانون کو چیلنج نہیں کیا، جو اخلاقیات ہی نہیں بلکہ سماجی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا، آخر اس کے خلاف عدالت میں عرضی کیوں نہیں داخل کی جاتی؟ پھر حیرت یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے اس معاملہ میں مرکز کی نمائندگی کرنے والے اٹارنی جنرل سے تعاون کرنے کو کہا ہے، ظاہر ہے جو خود جانب دار اور عرضی کا حامی ہو وہ کیا تعاون کرسکتا ہے؟

☆☆☆

❑ انکار حدیث

احمد امین کے وضع کردہ اصولوں کی حقیقت

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

احمد امین کے وضع کردہ اصول:

استاد احمد امین نے کچھ ایسے اصول بیان کیے ہیں جن کی نقد حدیث کے وقت محدثین کو رعایت کرنی چاہئے تھی:

ان کے مطابق مندرجہ ذیل امور پر توجہ کرنی ضروری تھی:

۱۔ وہ حدیث جن حالات میں کہی گئی ہے، ان سے کس قدر ہم آہنگ ہے؟

۲۔ کیا تاریخی واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟

۳۔ حدیث کا انداز ایسا فلسفیانہ تو نہیں جو آنحضورﷺ کے انداز کلام سے مختلف ہو۔

۴۔ کہیں حدیث کے الفاظ فقہی متون سے ملتے جلتے تو نہیں؟

۵۔ حدیث مطابق واقعہ ہے بھی، یا نہیں؟

۶۔ کہیں اسے وضع کرنے کا کوئی سیاسی سبب تو نہیں؟

۷۔ حدیث عہد رسالت کے ماحول سے میل کھاتی ہے یا نہیں؟

۸۔ راوی نے وہ حدیث کسی ذاتی غرض کے لیے تو وضع نہیں کی؟

احمد امین کہتے ہیں کہ اگر محدثین ان اصولوں پر توجہ دیتے تو بہت سی ایسی احادیث جو فی الحقیقت موضوع ہیں اور محدثین نے انھیں صحیح مان لیا ہے، ان کی حقیقت ان پر ظاہر ہو جاتی، پھر انھوں نے ایسی چند حدیثیں پیش کی ہیں:

احمد امین کے وضع کردہ اصولوں کی حقیقت: حقیقت یہ ہے کہ احمد امین نے ان اصولوں کو وضع کر کے کوئی تیر نہیں مارا ہے، اگر آپ غور کریں تو پائیں گے کہ موصوف نے ان میں جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ پہلے سے ہی محدثین کے اصولوں میں موجود ہیں اور محدثین نے انھیں پوری طرح برتا ہے۔ ہم مندرجہ ذیل صفحات میں نمبر وار دکھائیں گے کہ محدثین نے ان کے بیان کیے ہوئے آٹھوں اصولوں کو کس طرح برتا ہے:

۱۔ احمد امین نے ایک بات یہ کہی تھی کہ محدثین نے اس پر توجہ نہیں دی کہ جو بات کہی گئی ہے وہ عہد رسالت کے ظروف واحوال سے ہم آہنگ بھی ہے یا نہیں، موصوف کی یہ بات بہتان ہے، یہ تو نقد متن کا بنیادی اصول ہے، اور اسی اصول کی بنیاد پر محدثین نے اس روایت کو رد کر دیا جس میں حمام کا ذکر آیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ عہد رسالت میں حجاز میں حمام کا وجود نہ تھا۔

۲۔ کیا روایت تاریخی واقعات سے ہم آہنگ ہے؟ ''محدثین نے ان کے اس اصول کو بھی برتا، اسی وجہ سے اہل خیبر پر جزیہ نافذ کرنے والی روایت کو قبول نہ کیا، اس لیے کہ یہ تاریخی واقعات کے خلاف ہے، بلکہ محدثین نے اس سے بھی آگے بڑھ کر تاریخی اصولوں کا استعمال کیا، چنانچہ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ راوی جو اپنے شیخ سے روایت کر رہا ہے وہ اس سے ملا بھی ہے یا نہیں، ان دونوں کی ولادت ووفات کی تاریخ کیا ہے۔

۳۔ حدیث کے فلسفیانہ اسلوب کلام پر مشتمل نہ ہونے کا اصول ''رکاکت لفظی'' کے تحت داخل ہے، چنانچہ محدثین ایسے رکیک الفاظ پر مشتمل روایت کو قبول نہیں کرتے جو رسول اللہﷺ کی زبان سے صادر نہ ہو سکتے ہوں۔ کوئی بھی ایک ایسی حدیث نہیں دکھائی جا سکتی جو فلسفیانہ الفاظ پر مشتمل ہو اور محدثین نے اسے صحیح قرار دے دیا ہو۔

۴۔ یہ اصول کہ حدیث متون فقہ سے مشابہ نہ ہو محدثین نے اس کی بھی رعایت کی ہے، چنانچہ انھوں نے یہ شرط لگادی ہے کہ حدیث متعصب راوی کے مسلک کی مؤید نہ ہو، اسی اصول کی بنا پر محدثین نے عقائد سے متعلق بہت سی روایات کو رد کردیا ہے، اسی طرح فقہی مسائل سے متعلق بہت سی روایات کو بھی اس اصول کی بنیاد پر تسلیم نہیں کیا گیا، مثلا ان روایات کو موضوع قرار دیا گیا کہ ''جنبی کے لیے تین مرتبہ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے، اور جب کپڑے پر ایک درہم کے برابر خون لگا ہو تو اسے دھویا جائے اور نماز لوٹائی جائے''۔ اس کی تفصیل کے لیے نصب الرایۃ، ابن جوزی کی الموضوعات اور سیوطی کی اللآلی المصنوعۃ کی طرف رجوع کیجئے۔

۵۔ یہ اصول کہ حدیث واقعہ کے مطابق بھی ہے یا نہیں، محدثین کے نزدیک مشہور ومعروف ہے اور اس کی بنیاد پر انھوں نے بہت سی روایات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، مثلاً یہ حدیث کہ ''سو سال کے بعد کوئی بھی ایسا بچہ پیدا نہ ہوگا جس کی اللہ کو کچھ بھی ضرورت ہو'' (یعنی اس میں کچھ بھی بھلائی ہو)، یہ حدیث تجربہ ومشاہدے کے خلاف ہے، اس لیے کہ اکثر ائمہ وفضلاء پہلی صدی ہجری کے بعد ہی پیدا ہوئے، اسی طرح یہ روایات کہ ''بیگن ہر مرض کی دوا ہے'' اور ''مسور کی دال کھایا کرو اس لیے کہ وہ مبارک ہے دل کو نرم کرتی ہے اور آنسو بکثرت لاتی ہے'' اس لیے رد کردی گئیں کہ یہ طب اور تجربہ کے خلاف ہیں۔

۶۔ یہ اصول کہ ''حدیث سیاسی حالات کی پیداوار نہ ہو'' بھی محدثین کے نزدیک تسلیم شدہ ہے، اسی وجہ سے محدثین نے حضرت علیؓ کے بارے میں غالی شیعوں کی روایات، حضرت ابوبکرؓ وعثمانؓ کی محبت میں غلو کرنے والوں کی ان کی شان میں بیان کی گئی روایات، متعصب امیوں کی فضائل بنوامیہ کے سلسلے میں اور متعصب عباسیوں کی فضائل بنوعباس کے سلسلے میں نقل کی گئی روایات کو رد کردیا ہے، محدثین اس سے بخوبی واقف تھے کہ سیاسی حالات کا بھی وضع حدیث میں بڑا اثر ہے، اس لیے انھوں نے اس پہلو کو سامنے رکھ کر خوب اچھی طرح تنقید کی اور ایسی ایک ایک حدیث کو الگ کردیا۔

۷۔ ''یہ اصول کہ حدیث عہد رسالت کے ماحول سے میل کھاتی ہے یا نہیں'' بھی محدثین کے یہاں عام تھا، اس کی بنیاد پر اس حدیث کو رد کردیا گیا کہ ''میری آنکھیں دکھیں تو میں نے جبریل سے شکایت کی، انھوں نے مجھ سے کہا کہ قرآن کریم کو دیکھتے رہیے''۔ کیونکہ عہد رسالت میں قرآن اس طرح کتابی صورت میں موجود نہ تھا جسے دیکھا جاسکتا۔

۸۔ یہ اصول کہ ''راوی نے وہ حدیث کسی ذاتی غرض کی وجہ سے تو وضع نہیں کی'' محدثین اس سے بھی غافل نہیں رہے بلکہ ان کا اصول ہے کہ ''کبھی راوی کے حال سے بھی وضع کا پتہ لگ جاتا ہے'' اس کی بنیاد پر انھوں نے یہ روایت کہ ''دلیا کمر کو مضبوط کرتا ہے'' تسلیم نہ کی، کیونکہ یہ حدیث ایک دلیا فروش نے وضع کی تھی، اسی طرح یہ حدیث کہ ''تمہارے بچوں کے معلم تم میں شریر ترین ہیں'' رد کردہ کیونکہ اس کے راوی سعد بن ظریف نے یہ اس وقت وضع کی جب اس کا بیٹا اس کے پاس روتا ہوا آیا اور سے بتایا کہ استاد نے مجھے پیٹا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ احمد امین کے بیان کردہ ان اصول وقواعد کو محدثین نے پہلے ہی برتا ہے؛ بلکہ ان سے بھی زیادہ گہرائی وگیرائی کے ساتھ برتا ہے، اگر احمد امین کتب موضوعات کا مطالعہ کرتے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ محدثین نے احادیث موضوعہ کی جو علامات بیان کی ہیں وہ پندرہ سے بھی زیادہ ہیں۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ محدثین نے ان اصولوں کو اندھا دھند استعمال نہیں کیا، جیسا کہ احمد امین اور ان کے پیش رو مستشرقین نے کیا، بلکہ پہلے انھوں نے احادیث کو اسنادی اصولوں پر جانچا پرکھا، جو ان پر فٹ نہیں بیٹھیں تو انھیں رد کردیا، اور جو باعتبار سند کے درست ثابت ہوئیں تو انھیں قبول کیا۔ سنداً صحیح ہونے والی بس انہی روایات کو رد کیا جن میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ تھی، یہ نہیں کہ بس جو حدیث بھی ذرا سی عقلی توجیہ کے خلاف نکلی اسے فوراً جھٹلادیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا نام ہے، اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی ایسی خصوصیات سے نوازا گیا ہے، جن

سے ایک عام آدمی بہرہ ور نہیں، آپ کو جوامع الکلم عطا کیے گئے، قانونی اقتدار سے نوازا گیا اور بہت سے غیبی امور پر مطلع کیا گیا، اس لیے آپ کی باتوں کو بالکل اس طرح نہیں جانچا جاسکتا، جیسے ایک عام آدمی کی بات کو جانچا جاتا ہے، اس لیے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے بہت سی ایسی باتیں ارشاد فرمائیں جو آپ کے زمانے کے معیار فہم سے بلند ہوں، مگر آنے والے زمانے کے عین مطابق ہوں، یا اسی طرح آپ بعض احکام کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان فرمادیں جو دیکھنے میں قانونی و فقہی انداز کے ہوں مثلاً "البیعان بالخیار مالم یتفرقا"، "لا تنکح المرأۃ علی عمتھا و لا خالتھا" اور "یحرم من الرضاعۃ مایحرم من النسب "تو اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ احادیث تو ایسے قانونی انداز کی ہیں جو بعد میں پیدا ہوا، اس لیے کہ آپ ﷺ قانون بیان کرنے بھی آئے تھے اس لیے اگر اس طرح کی تعبیرات آپ نے استعمال کیں تو اس میں تعجب کیسا! اسی طرح اگر آپ نے کچھ فقہی احکام بیان کیے اور بعد میں فقہاء نے ان کو انھی الفاظ سے کتب فقہ میں نقل کردیا، تو یہ کہہ کر یہ احادیث تو فقہی متون کے مشابہ ہیں، انھیں رد نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ خود فقہاء نے اپنے الفاظ کو ان احادیث پر مبنی کیا، نہ کہ احادیث فقہی متون پر مبنی ہیں۔

اسی طرح آپ نے بہت سے نباتات اور پھلوں کی خاصیات سے بھی آگاہ فرمایا اور ہوسکتا ہے کہ یہ آپ کی نبوت کا اعجاز ہو، لہذا اگر کسی دور میں لوگوں پر کسی ارشاد رسول کی حکمت و مصلحت واضح نہ ہوسکے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ موضوع ہے، اس لیے کہ ذات نبی اپنے علوم و معارف اور اہلیت و صلاحیت کے اعتبار سے عام انسانوں سے بدرجہا بلند تھی۔

کبھی آپ ایسے امور غیبیہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں جو مستقبل میں پیش آئیں گے، ایک شخص فوراً ان پر تنقید کرنے لگتا ہے، حالانکہ ابھی ان کے وقوع میں کافی وقت ہوتا ہے۔

اس لیے محدثین کرام سنداً کسی حدیث کے صحیح ہونے کے بعد ذرا سے شبہ کی بنیاد پر اسے رد نہیں کردیتے؛ بلکہ بہت سے دیگر پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں، برخلاف مستشرقین کے کہ وہ آنحضور ﷺ کی احادیث کو بھی اسی ترازو میں تولتے ہیں جس سے عوام الناس کی باتوں کو جانچا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضور ﷺ کے مقام و مرتبے سے ناآشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب کسی حدیث میں معجزہ کی خبر دی گئی ہو یا کوئی حدیث قانونی الفاظ سے ملتی جلتی ہو، یا کسی حدیث میں مستقبل کی کسی بات کی خبر دی گئی ہو تو فوراً اسے رد کردیتے ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ احمد امین جیسے مستشرقین کے اندھے مقلدین بھی اسی رَو میں بہہ گئے، بلکہ انھوں نے ہمارے علماء کی بھی مذمت شروع کردی کہ وہ متن حدیث پر تنقید نہیں کرتے، حالانکہ ان کا خود کا یہ حال ہے کہ بس مستشرقین کی کہی ہوئی باتوں کو دہرا دیتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں ذرا سا اضافہ بھی نہیں کرتے، احمد امین صاحب کی مذکورہ گزارشات میں مجھے ایک بات بھی ایسی نہ جو مستشرقین کی خوشہ چینی پر مبنی نہ ہو۔

مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود وہ نقد حدیث کے معاملے میں عقل کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی عقل کو معیار ٹھہراتے ہیں، اس لیے کہ بسا اوقات ایک بات کسی شخص کی عقل میں نہیں آتی، مگر دوسرا اسے سمجھ لیتا ہے، یا وہ ایک زمانے میں ناقابل فہم و ادراک ہوتی ہے، مگر دوسرے زمانے کے فہم کے عین مطابق ہوتی ہے۔

اس لیے صرف عقل کی بنیاد پر نقد حدیث کا دروازہ چوپٹ کھول دینا بے حد خطرناک ہے، نقد حدیث کی اس کھلی اجازت کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پھر سنت صحیحہ کی کوئی مضبوط بنیاد ہی نہ رہے گی۔

احمد امین نے اس غلط طریق کار کا انتخاب کرکے بہت سی فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اس میں ان سے عبرت لینی چاہئے، موصوف نے بعض ان احادیث کو بھی جھٹلا دیا ہے جن کی صحت پر دلائل و شواہد قائم ہوچکے تھے، اگلے مضمون میں ہم کچھ اس طرح کی مثالیں پیش کریں گے۔

☆☆☆

❑ حکمت عملی

پیغمبر انقلاب کی حکمت عملی

شان محمد ندوی
استاد: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

ہم تاریخ ''history'' کے سب سے پرخطر دور سے گزر رہے ہیں، کل دنیا بدل جائے گی ، وقت آ گیا ہے کہ ہم بیدار ہو جائیں اور اپنا محاسبہ کریں اور آپس کے جھگڑے مٹا کر ایک ہو جائیں جسکا قرآن ہم سے مطالبہ کرتا ہے اور صاف اعلان کرتا ہے"واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا" اور ہم نبی آخرالزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت وسیرت کی طرف واپس لوٹیں کیونکہ وہی ہمارے لئے راہ عمل ہے اور قرآن بھی اسکا شاہد ہے "لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة"الى آخر الآية کہ وہ انسانیت کا ایک پورا مکمل نمونہ ہیں، اور ہر انسان کے لیے ان کے قدم پر چلنا لازم ہے۔ جس طرح آپ نے تمام اعمال کرنے کا طریقہ بتایا ہے، اسی طرح آپ نے حالات کو سمجھنا اور اس سے آگاہ رہنا بھی سکھایا ہے تو جس طریقے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے طریقے کے مطابق کھانا کھانا، داڑھی رکھنا، بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا سنت ہے۔ اسی طرح دنیا کے حالات سے باخبر رہنا اور انکو اپنے موافق کرنے کی کوشش کرنا بھی سنت ہے، اس لیے کہ آج حق اور باطل میں مسلسل جنگ جاری ہے اور جھوٹ کی طرفدار طاقتیں آئے دن امت محمدی پر اپنے شکنجے کستی جارہی ہیں، اس جنگ میں ہمیں کونسے طریقۂ کار پر عمل کرنا چاہئے جو اس جنگ میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکے، اسکے لیے ہمیں سب سے پہلے ماضی کی طرف لوٹنا چاہئے، اور فہم وادراک اور بصیرت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی اور اسلام کے پہلے مرحلے کے اس نازک وقت کو پیش نظر رکھ کر موازنہ کرنا چاہئے کہ کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین حالات کا مقابلہ کیا، آج درحقیقت وہ واقعات ہمارے لئے عملی نمونہ ہیں اور ہمیں ان واقعات سے موجودہ حالات میں سبق لینے کی ضرورت ہے۔

سبق آموز تجزیہ:

ابھی جزیرۃ العرب سے اسلام کی کرنیں نکلی ہی تھیں، ابھی اسلام کا درخت تن آور بھی نہیں ہوا تھا، ظلم ناانصافی اور بے راہ روی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں انصاف، امن وہدایت کا چراغ ابھی جلا ہی تھا کہ ابلیسی طاقتوں میں طوفان برپا ہوگیا، اور ظلم ناانصافی اور جھوٹ کی طرفدار طاقتیں یعنی قریش نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑنے کا اعلان کردیا، سچ اور جھوٹ، حق وباطل، ظلم اور انصاف کے درمیان جاری اس جنگ میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے ہوئے اور کل جو صادق وامین کہہ کر پکارتے تھے آج وہ پاگل، دیوانہ اور مجنوں گردانے لگے، کل جو دوست تھے وہ آج دشمنی

پر آمادہ ہوگئے حتی کہ اپنے بھی پرائے ہوگئے اور سرزمین مکہ وسعت کے باوجود آپ اور آپ کے متبعین کیلئے تنگ ہوگئی۔ اب آپؐ کے پاس صرف دو راستے تھے یا تو آپ مکہ میں رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے یا ہجرت کو ترجیح دیتے۔ آپ ﷺ اپنی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے حکم خداوندی سے مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر گئے، لیکن دشمن ان کا پیچھا کرتے ہوئے مدینہ بھی پہونچ گئے؛ جس کے نتیجے میں جنگ بدر ہوئی جس میں مسلمانوں نے انہیں شکست دی۔ یہ ہار ان لوگوں کیلئے بہت ہی شرمناک تھی، اس شکست سے انہیں بہت شرمندگی ہوئی۔ اس ہار سے قریش نے بہت ذلت محسوس کی اور انتقام لینے کی غرض سے اتنا بڑا لشکر اکھٹا کیا جتنا وہ کر سکتے تھے اور ایک بار پھر حملہ کیا، اور جنگ احد ہوئی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی، وہ مسلمانوں کے اتنے نزدیک تو نہیں آسکے کہ انہیں قتل کر دیں کیونکہ وہ پیچھے ہٹ کر پہاڑوں پر چلے گئے وہ مسلمانوں پر حاوی تو آ گئے لیکن وہ انہیں تباہ و برباد نہیں کر سکے جیسا کہ ان کا ارادہ تھا، اس لیے یہ جنگ بے نتیجہ رہی، مگر پھر بھی انھوں نے اعلان کیا کہ بدر کا بدلہ پورا ہو گیا، کیونکہ ہم نے احد میں تمہیں یعنی مسلمانوں کو ہرا دیا لیکن جنگ ابھی جاری ہے، اس کے بعد انہوں نے اتنا بڑا لشکر جمع کیا جتنا وہ کر سکتے تھے تا کہ وہ اس بار مسلمانوں کو، ہمیشہ کے لیے ختم کر سکیں، لیکن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے، انھوں نے ہمارے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا لیکن وہ اس بار پھر ناکام رہے اور انہیں اپنے خیمے اکھاڑ کر واپس گھر لوٹنا پڑا، اس بار جو ہوا اسے فوجی ناکامی کہنا چاہیے، اس لیے کہ اتنا بڑا لشکر بھی ناکام واپس لوٹا، کیا ہونے والا ہے؟ وہ ہمیں خندق پر کیوں گھیرے ہوئے تھے؟ ہماری طرف صرف عرب اور یہود تھے جن سے ہم نے ایک معاہدہ کیا تھا جو میثاق مدینہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس معاہدے اور گٹھ جوڑ کی کچھ شرطیں تھی جیسے ہر معاہدے میں کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔

ایک شرط تو یہ تھی کہ جو اس معاہدے کے تحت قبیلے ساتھ آئے ہیں وہ کبھی اپنے ساتھی قبیلے کے مقابلے اس کے دشمن قبیلے کا ساتھ نہیں دیں گے، لیکن یہودیوں نے اس شرط کو توڑا تو جیسے ہی خندق کی ناکامی کے بعد قریش واپس اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے ہم نے بنوحنیفہ سے پہلے بنوقریظہ کے خلاف ایکشن لیا، یہودی خیبر کی طرف بھاگ گئے انہیں مدینے کی جاگیروں کو چھوڑنا پڑا اور وہ غم اور غصے کی شدت سے اپنے ہونٹ چبا رہے تھے، وہ ہمارے خون کے پیاسے ہو چکے تھے اور ہم سے انتقام چاہتے تھے تو انھوں نے خیبر کو اپنا بیس بنایا اور دوسری طرف قریش میں مایوسی چھائی ہوئی تھی، جو کچھ ان کے پاس تھا وہ خندق کی ناکام جنگی مہم میں کام آچکا تھا۔

اگر مسلمان مدینے میں اس وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو کیا نتیجہ نکلتا؟ خیبر اور مکہ ہمارے مقابلے پر ایک ہو جاتے۔ خیبر شمال مغرب میں ہے اور مکہ جنوب میں اور ہم ان دونوں کے بیچ میں پس کر رہ جاتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کے ان تقاضوں کو سمجھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ ہدایت اللہ تعالی نے خود انہیں بھیجی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا جس کو ان کی دوراندیشی کہنا زیادہ مناسب ہوگا انہوں نے دیکھا کہ وہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں، لیکن کعبہ تو مکہ میں ہے اور مکہ والوں سے تو برابر جنگ جاری ہے تو وہ کعبہ کس طرح جا سکتے ہیں، یہ امن اور صلح کی شروعات کی طرف بڑھایا گیا وہ قدم تھا جس کی ضرورت ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اس وقت محسوس کر رہی تھی، وہ اس خواب سے جاگے ہجرت کو چھ سال ہو چکے تھے، انہوں نے اعلان

کیا کہ وہ عمرہ کو جا رہے ہیں، اب قریش انہیں زیارت کعبہ سے روک نہیں سکتے تھے اس لئے کہ یہ ہر عرب کا حق تھا، اس حالت میں اگر قریش منع کرتے تو عرب کے لوگ انکے خلاف ہو جاتے قریش کے لیے ذہنی کشمکش آخری درجے پر تھی، اور مسلمانوں کی طرف دیکھیں تو ڈپلومیسی کی ایک بے نظیر مثال۔ امن وصلح کی مہم انکے خلاف جنہوں نے آپ کے خلاف جنگی مہم چھیڑ رکھی تھی، اللہ نے مسلمانوں کو خیبر سے پہلے مکہ جانے کی ہدایت کی کیونکہ اس کی ایک وجہ ہے، اگر مسلمان اس وقت مکہ پر چڑھائی کرتے تو خیبر انکی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر مدینہ پر قبضہ کر لیتا۔ اور مسلمان اپنا base کھو دیتے تو وہ جنوب کی طرف نہیں بڑھ سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے مدینہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جاتا، اگر مسلمانوں نے یہ اعلان نہیں کیا ہوتا کہ ہم مکہ کعبہ کی زیارت کو آنا چاہتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے مکہ پر حملہ کیا ہوتا تو خیبر ان کی غیر موجودگی میں مدینہ پر قبضہ کر لیتا اور اگر وہ خیبر پر چڑھائی کرنے کے ارادے سے مدینہ چھوڑتے تو مکہ والے مدینہ پر قبضہ کر لیتے کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں مدینہ کی حفاظت ممکن نہ تھی۔ تو صورت حال یہ تھی کہ ہم دکھن کی طرف جا کر مکہ پر حملہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ہم شمال مغرب میں خیبر پر حملہ کر سکتے تھے کیونکہ دونوں صورتوں میں مدینہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو کچھ کرنا بھی ہے، لیکن اگر مسلمانوں نے مدینہ کعبہ کی زیارت کے لیے چھوڑا ہے اور خیبر ان کی غیر موجودگی میں مدینہ پر حملہ کر دیتا تو سارا عرب ان کی طرفداری میں کھڑا ہو جاتا، کہ تم ان لوگوں کے شہر پر کس طرح حملہ کر سکتے ہو، جو اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے نکلے ہیں، کیا تم میں بالکل غیرت نہیں بچی۔ یہی اس امن کی مہم کی دور اندیشی تھی، مدینہ پر خیبر کے حملہ کے خوف کے بنا مسلمان مکہ کی طرف سفر کر سکتے تھے، مکہ والوں نے 200 گھڑ سواروں کا ایک دستہ ان کی راہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خبری دستہ بھی تھا انہیں اس کی خبر مل گئی اور وہ ایک دوسرے راستے سے ہو کر قریش کے اس دستہ کو پیچھے چھوڑنے میں کامیاب ہو گئے جس کی کمان خالد بن ولید کے ہاتھ میں تھی یہاں تک کہ وہ حدود حرم میں کامیابی کے ساتھ داخل ہو گئے۔ حرم وہ پاک علاقہ ہے جہاں آپ کسی پر حملہ نہیں کر سکتے جیسے ہی ہم یعنی مسلمان حرم کی حدود میں داخل ہوئے اور انھوں نے حدیبیہ نام کی جگہ پر پڑاؤ ڈالا، اب فیصلہ مکہ والوں کو کرنا ہوگا۔ گیند اب مکہ کے پالے میں ہے مکہ اب کیا کرے گا۔ اب وہ انھیں اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو سارا عرب ان کا مذاق اڑائے گا۔ اور وہ انھیں روک بھی نہیں سکتے کیوں کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو سارا عرب ان کے خلاف ہو جائے گا کیونکہ وہاں کے روایتی قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ انہوں نے اپنے بزرگوں میں سے ایک شخص کو مسلمانوں کے پاس بات کرنے کے لیے بھیجا اور جب وہ واپس لوٹا تو اس نے انھیں آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص سے مقابلہ مت کرو۔ میں راجاؤں اور شہنشاہوں کے دربار دیکھ چکا ہوں مگر میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس سے اتنی محبت کرتے ہوں جتنی محمد ﷺ سے اس کے ساتھی کرتے ہیں۔ یہ انسان امن کا پیغام لے کر آیا ہے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں سوائے تلوار کے جسے عرب کی روایت کے مطابق ہر انسان اپنے پاس رکھ سکتا تھا، اسکے بعد انہوں نے ایک اور شخص کو بھیجا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ مشرک ہونے کے باوجود نیک طبیعت انسان ہے، یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کی نفسیات یعنی

war of Psychological کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ اس شخص کے کردار کو پہچان چکے تھے، اس دور میں قربانی کے جانور بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجائے جاتے تھے اور ان کے گلے میں ہار وغیرہ ڈالے جاتے تھے تو جو بھی انہیں دیکھتا تھا وہ فوراً پہچان لیا کرتا تھا کہ یہ قربانی کا جانور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان جانوروں کو اس شخص کے سامنے سے گزارا جائے تا کہ وہ انہیں دور ہی سے دیکھ لے۔ کیونکہ ہر عرب قربانی کے جانور کو دور سے ہی پہچان سکتا ہے، جب آنے والے شخص نے ان قربانی کے جانوروں کو دیکھا تو اتنا متاثر ہوا کہ واپس لوٹ گیا۔ قریش کو پتہ چل گیا کہ اب ان کے پاس مسلمانوں سے نیگوشیٹ (Negotiate) یعنی بات چیت کرنے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے سہیل ابن عمرو کو بھیجا جو ایک ماہر Diplomate تھا سہیل اس مشن کے ساتھ پہنچا تھا کہ ایسی صورت نکالی جائے جس سے قریش اور زیادہ شرمندگی سے بچ سکیں۔ کچھ ایسا نتیجہ نکل آئے جس کی نقاب میں قریش اپنا منہ چھپا سکیں۔ قریش نے مسلمانوں کے سامنے دس سال تک جنگ بندی کی پیشکش رکھی، دس سال تک کوئی جنگ نہیں، اگر انہوں نے پانچ سال کی پیشکش رکھی ہوتی تو مسلمان اسے بھی قبول کر لیتے اگر انہوں نے یہ مدت 15 سال رکھی ہوتی تو ہم اسے بھی قبول کرتے کیونکہ جنگ بندی اس وقت کے تقاضے کے حساب سے ہمارے لئے بہت اہم تھی، لیکن قریش مسلمانوں کا خون بھی بہانا چاہ رہے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس سال عمرہ نہیں کریں گے اور مسلمانوں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ اس لئے کہ دانے اور چھلکے میں فرق ہوتا ہے۔ اور مسلمان چھلکے کے لیے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے ، بلکہ وہ دانہ چاہتے تھے تو یہ ایک تدبیر تھی۔ اسکے بعد انہوں نے کہا کہ تمہیں قربانی یہیں حدیبیہ میں کرنی ہوگی تو یہ عرب میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ قربانی تو ہمیشہ مکے میں ہوتی آئی ہے یہ حدیبیہ میں کیسے ہوسکتی ہے کوئی مسلمان اس کے لئے راضی نہیں تھا تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے ایک نے رائے دی کہ آپ پہل کیجئے وہ مان جائیں گے۔ آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں میں چھری لی اور ایک جانور کو ذبح کیا اب سارے مسلمانوں نے بھی یہی کیا لیکن ابھی وہ زخم میں اور نمک چھڑکنا چاہتے تھے صرف اتنا نہیں ہے کہ تم اس سال عمرہ نہیں کرو گے بلکہ تم کعبہ کی زیارت بھی نہیں کر سکتے، تم اگلے سال تم آسکتے ہو لیکن صرف تین دن کے لیے آنا، ہم ان تین دن کے لیے شہر خالی کر دیں گے۔ انہوں نے ایسا اس لیے نہیں کہا تھا کہ وہ ہم سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ کچھ اور وجہ بھی تھیں اور وہ وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی مکی اسلام قبول کر کے مدینہ پہنچتا ہے اور تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو تمہیں اس شخص کو واپس بھیجنا ہوگا لیکن اگر مدینے سے کوئی مکہ واپس آتا ہے تو ہم اسے واپس نہیں بھیجیں گے۔ اس شرط کو مسلمان کسی بھی طرح قبول کرنے کو تیار نہیں تھے بظاہر یہ شرط بالکل یک طرفہ تھی اور اس میں صرف قریش کا فائدہ تھا تو ہم ایسی شرط کو کیوں مانیں جو صرف قریش کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں وہ دیکھ رہی تھیں جسے دوسروں کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب اسلام سے متاثر مکہ کے لوگ مدینہ آئینگے اور ہم انہیں اس معاہدے کی وجہ سے وہاں نہیں روک پائیں گے تو وہ کہاں جائیں گے، وہ اس جگہ جائیں گے جسے قریش پسند نہیں کرتے اور ہمیں اس کے لئے ذمہ دار بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہم اسلئے حدیبیہ کے معاہدے پر راضی ہو گئے۔ کبھی کبھی اسے صلح بھی کہا جا سکتا ہے یعنی "peace"treaty لیکن یہ صلح نہیں ہے یہ حد نہ ہے جنگ

بندی، ایک طے شدہ وقت تک کوئی جنگ نہیں۔ اللہ تعالی نے سورہ فتح میں حدیبیہ کے معاہدے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں "انا فتحنا لك فتحا مبينا" (سورۃ الفتح:۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تمہیں ایک شاندار فتح سے نوازا۔ آپ ﷺ واپس لوٹ آئے، آپ صلی علیہ وسلم کسی سے بات نہیں کر رہے ہیں اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ یہ ہے سچی رہنمائی، آپؐ نے مسلمانوں کو دو ہفتے تک آرام کرنے دیا اور دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہی اعلان کرتے ہیں کہ ہم خیبر پر چڑھائی کرنے جا رہے ہیں۔ آج اور اسی وقت، تمہارے پاس تیاری کے لیے دو چار دن نہیں ہیں بلکہ آج اور اسی وقت ہم خیبر پر چڑھائی کرنے جا رہے ہیں۔ یہ تھی اللہ کے رسول ﷺ کی حکمت عملی، اس صورت میں جاسوس اس کی خبر نہیں بھیج سکتے تھے یہ ایک الگ طرح کی شروعات ہے۔ یہ پرامن مہم نہیں ہے۔ اب مسلمان مدینے کی طرف سے بے فکر تھے کیونکہ قریش کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا ان کی طرف سے مدینہ محفوظ تھا، یہ ڈپلومیسی کی بہترین مثال ہے۔ جب صبح کے وقت مسلمان خیبر پہنچے اور یہودی باہر آئے تو انہوں نے آپؐ کو اپنی آنکھوں کو ملتے ہوئے دیکھا ارے یہ تو محمد ہیں۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔ یہ آرمی اسٹریٹیجی کی بہترین مثال ہے۔ خیبر والوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی کو مدد کے لئے بلاتے، مسلمانوں نے خیبر کو گھیر لیا اور محاصرہ یعنی seize شروع ہوگئی درحقیقت جب اللہ نے کہا "انا فتحنا لك فتحا مبينا" تو اس بات نے اسی دن سے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ جس دن حدیبیہ کی treaty پر دستخط کئے تھے۔ خیبر اسی دن گر گیا تھا بس ظاہری طور پر تھوڑا وقت باقی تھا۔ حدیبیہ کی treaty نے خیبر کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔ بظاہر تھوڑی دیر لگنی تھی (کاش ویسی سوچ اور دوراندیشی ہمارے پاس آج بھی ہوتی) آخرکار خیبر فتح کر لیا گیا اور جس دن خیبر اکھڑا مکہ بھی اسی دن فتح ہو گیا۔ صرف تھوڑی دیر باقی تھی۔ سارا عرب دیکھ رہا تھا۔ اب تک بدر ہو چکی تھی۔ احد ہو چکی تھی۔ خندق ہو چکی تھی۔ سارا عرب ان جنگوں کو دیکھ رہا تھا جن کا ابھی تک آخر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ انہوں نے حدیبیہ میں معاہدے کو ہوتے دیکھا، اور سنا، انہیں معلوم ہوا کہ اس معاہدے میں مسلمانوں کو قریش نے ایک پارٹی تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ اس معاہدے میں طے ہوا تھا کہ اگر عرب کا کوئی قبیلہ قریش یا مسلمانوں میں سے کسی کی طرف آنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کرنے کے لیے آزاد ہے۔ تو اب مسلمانوں کے پاس اپنا ایک سیاسی ڈھانچہ ہے۔ جو عرب میں قریش کے برابر ہے۔ اس کا اثر سارے عرب پر ہوا ہے۔ حدیبیہ کی treaty، خیبر پر چڑھائی جس میں یہودیوں کو شکست اور مسلمانوں کی فتح نے سارے عرب کو نئی طرح سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عرب قبیلے مسلمانوں کو ایسی طاقت ماننے لگے ہیں جس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ ایک ایسی طاقت جس میں وہ آنا چاہتے ہیں اور ایک ایک کر کے کئی قبیلے اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سب عرب کی سیاسی ماحول میں آئی اس تبدیلی کا نتیجہ تھا جو مکے سے صلح اور خیبر پر ہماری زبردست فتح کے نتیجے کے بعد وہاں آئی۔ 6 ہجری سے 8 ہجری تک دو سال کا وقفہ ہوا خیبر کی جنگ 6 ہجری میں ہوئی اور آٹھ ہجری تک جیسے جیسے عرب قبیلے مسلمانوں کی طرف آتے جا رہے تھے، طاقت بڑھتی جا رہی تھی! مکے والے مایوس ہوتے جا رہے تھے! کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیروں کا ان کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ قریش کے طرفدار قبیلے نے اس قبیلے پر حملہ کر دیا جو مسلمانوں کا طرفدار تھا۔ کچھ لوگ مارے گئے اور خون ایک بار پھر بہا اور

معاہدہ ٹوٹ گیا۔اس معاہدے کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی جو جنگ بندی کی شرط تھی وہ بھی ٹوٹ گئی تو اب معاہدہ ٹوٹ گیا،قریش اس بات کومحسوس کررہے ہیں،لیکن اب وہ چاہتے ہیں کہ جنگ بندی جاری رہے۔وہ مخالفت کے ایک نئے سلسلے کا آغاز نہیں چاہتے۔تو ابوسفیان جوقریش کا سردار ہے۔کیونکہ ابوجہل مرچکا ہے عتبہ مرچکا ہے اور کئی دوسرے سورما بھی جا چکے ہیں۔تو اب ابوسفیان خود مدینہ پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہتی ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس سے بات کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔کبھی کبھی خاموشی بھی کتنا کچھ کہہ جاتی ہے۔پھر وہ نبی کریم صلی اللہ وسلم کے پاس جاتا ہے لیکن وہ بھی اس سے ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں یعنی بات نہیں کرتے ہیں آخر وہ واپس مکہ لوٹ آتا ہے۔ابوسفیان کو معلوم ہوگیا کہ اب سب کچھ ختم ہوگیا۔بس تھوڑی دیر اور لگنی باقی ہے!ابھی ابوسفیان مکہ لوٹا ہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار آدمیوں کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں کیونکہ پچھلے دو سالوں میں بہت سارے قبیلے اسلام قبول کر چکے تھے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچ کر سرحد پر رات میں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔نبی کریم صلی اللہ وسلم کہتے ہیں اتنے الاؤ روشن کرو جتنے ممکن ہو۔ ہماری تعداد بھلے ہی 10000 ہے لیکن بیس تیس ہزار الاؤ روشن ہونے چاہیں۔کیونکہ قریش رات کو آکر ہمارے الاؤ شمار کریں گے تاکہ ہماری تعداد کا اندازہ کرسکیں اور جب الاؤ گننے کے لئے آئیں گے اور وہاں اتنے الاؤ دیکھیں گے تو ان کی ہمت جواب دے جائے گی۔ یہ جنگ کا نفسیاتی یعنی (Psycolozical) طریقہ تھا۔آپ نے دیکھا کہ وقت کہاں سے کہاں بدل گیا۔

سنت صرف یہ نہیں کہ داڑھی رکھ لی سنت طریقہ سے کھایا پہنا مگر کیا کچھ نہیں! یہ سب بھی ضروری ہے مگر ہمیں آس پاس کی سیاسی فضا کو سمجھنا ہوگا۔اور کوشش کرنی ہوگی کہ وہ ہمارے حق میں تبدیل ہوسکے۔

عالمی سیاسی ماحول : عالمی پیمانے پر اگر ہم سیاسی ماحول کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت ایک طرف تو ناٹو "Zionist Nato" ہے جو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج ہے۔تو دوسری طرف عیسائی یہودی اتحاد جس نے تمام شیطانوں کو اپنے پلڑے میں جمع کررکھا ہے،دنیا کی تمام دہشت گرد تنظیمیں انہیں کی پیداوار ہیں،جو ان کے آگے نہیں جھکتا ہے یہ اس کے خلاف اعلان جنگ کردیتے ہیں۔اب وہ معصوموں کا قتل اور خون بہانے کے لیئے اور نزدیک آنا چاہتے ہیں اور خطرناک جنگوں کا اعلان اور خاص طور پر عرب ملکوں کے خلاف تاکہ اسرائیل اپنا پولیٹیکل اور اکنامیکل اثر پہلے عرب پھر ساری دنیا پر قائم کرسکے اور دنیا کی سب سے بڑی قوت بن سکے،یہ گیم پلان ہے۔ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتلا دیا ہے۔کسی نے بھی اس حدیث کو ضعیف یا غلط نہیں بتایا ہے،آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم روم سے ایک معاہدہ کروگے۔روم کون ہے؟ روم سے مراد عیسائی دنیا ہے،لیکن عیسائی دنیا کے دو حصے ہیں ایک west کی عیسائیت ہے جس میں کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ عیسائیت شامل ہے۔ دوسرے تھوڑی سی الگ عیسائیت بھی ہے۔ جو Bezintine Empire میں پائی جاتی تھی،پہلی والی عیسائیت کرسمس 25 دسمبر کو مناتی ہے۔جبکہ دوسری عیسائیت غالبا 9 جنوری کو مناتی ہے۔اگر کسی کے خیال میں روم،ناٹو، یا اینگلو امریکن الائنس ہے تو اس کو دوبارہ تاریخ سے رجوع کرنے کی ضرورت

ہے۔ یہ روم بازن ٹائم امپایر ہے جس کا ہیڈ کوارٹر قسطنطنیہ میں تھا۔ اور جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس کے پیٹی عارش نے اعلان کیا کہ اب یہ ہڈ کوارٹر روس میں ٹرانسفر ہونے جا رہا ہے۔تو موجودہ روم جو تعبیر کرتے ہیں تو یہ معاہدہ دراصل روس سے ہے۔تو ہمیں اس روس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہئے جو روم ہے اس سے پہلے کہ ہمارا دشمن شیعہ سنی سول وار شروع کرے یعنی مذہبی عصبیت کو ہوا دے کر ہمیں آپس میں لڑائے یا تیسری بڑی عالمی جنگ کی شروعات ہو جس کے ہونے کے امکانات بہت قریب ہیں ،جسکو حدیث میں الملحمۃ الکبری اور آسمانی صحیفوں میں آرمیگڈن Armageddon کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جو جنگ پوری دنیا کے نقشے ہی کو بدل دے گی اور بلاتفریق مذہب وملت پوری دنیا اس کے لپیٹ میں آجائے گی اور اسرائیل اپنے حدود کی مراد کو پالیگا جو اس کا اصل مقصد ہے۔عالم اسلام کو بیدار ہو جانا چاہئے اور جو بھی شکل ممکن ہو، جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے بحرحال آپسی تعلقات کو استوار و مستحکم کر کے مسلم ممالک کو روس کے ساتھ معاہدہ کر لینا چاہے تا کہ عالمی دنیا کی قوت و توانائی معصوموں کے خون بہانے کے بجائے اس حقیقت کو قتل کرنے میں صرف کی جا سکے جو پس پردہ ہے۔اگر ہم اس معاہدہ میں کامیاب ہو جائے تو ہم ہونے والی بڑی جنگوں میں اسرائیل و امریکہ کے منصوبوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں اور اس طرح ہم دشمن کی ناپاک تدبیروں کو الٹ سکتے ہیں۔

قومی سطح پر سیاسی صورت حال:

اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کا جائزہ لیں تو آج ہندوستان کی بھی فضا ہمارے خلاف مسموم ہوتی جا رہی ہے۔اور فرقہ پرست طاقتیں ہمارے خلاف پنجہ جما چکی ہیں۔ ہماری آزادی کو چھیننے کا پورا جال تقریبا بنا جا چکا ہے۔ بلکہ بڑے دانشوروں کا یہاں تک کہنا ہے کہ اسلام مخالف طاقتیں ملک ہندوستان کو ہندو راشٹریہ بنانے کا پورا پلان تیار کر چکی ہیں۔اور نئے قوانین کا مسودہ لکھا جا چکا ہے۔بس اس کو نافذ کر کے ہماری آزادی کے پر کاٹنے کی دیر ہے۔اب ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں رہا اس سے پہلے کہ حریف اپنے مکر میں کامیاب ہو۔اس کی ناپاک تدابیر کو الٹنا اور وقت کے دھارے کو اپنے موافق کرنا بہت ضروری ہے۔لیکن کس طرح ہو تو اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے متحد ہو کر جو تدابیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی ہیں ان پر عمل کرتے ہوئے دلت طبقہ اور بہت سی غیر مسلم جماعتوں اور افراد جن کے دلوں میں ابھی انسانیت باقی ہے، جن کے ذہن ابھی زہریلے نہیں ہوئے ہیں یا جن کے ذہنوں کو ابھی برین واش نہیں کیا گیا ہے، ان کو ہمنوا بنا کر ان سے اتحاد کرنے کی ضرورت ہے۔اگر سنت پر عمل کرتے ہوئے ہم اس طبقے کو اپنے قریب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمارا اس سے دوگنا فائدہ ہوگا ایک تو ہمارے ہاتھ اسلام ہی نہیں بلکہ انسانیت کے دشمنوں کے خلاف مضبوط ہو جائیں گے۔اور وقت کا دھارا ہمارے موافقت میں بہے گا۔اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس طرح ان کو اپنے قریب لا کر اور اسلام کی دعوت دے کر حجت تمام کر سکتے ہیں جس کے لیے ہمیں بھیجا گیا ہے، ورنہ پوری انسانیت کی تباہی کے ہم خود ذمہ دار ہوں گے اور خدا کی طرف سے کوئی نصرت کا وعدہ نہیں ہوگا۔اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھے۔آمین!

☆☆☆

❑ گوشۂ رمضان

رمضان کے فضائل ومسائل

پیشکش: محمد فرید حبیب ندوی

نوٹ: یہ مضمون مختلف علماء کی تحریروں سے انتخاب کر کے تیار کیا گیا ہے۔

رمضان کی فضیلت : رمضان کا مہینہ بڑا مبارک اور فضیلتوں والا ہے، اس مہینے میں بہت سے اعمال ہیں، جن کو ادا کرنے پر بڑے اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے، ان میں سب سے اہم روزہ ہے ، اس کے علاوہ :تراویح،قرآن سننے ،سنانے، اعتکاف کرنے اور شب قدر کی عبادت کی بھی بڑی اہمیت ہے،، چونکہ یہ سارے اعمال رمضان میں انجام دیے جاتے ہیں، اس لئے اس ماہ کی بڑی فضیلت ہے ،ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''إذا دخل شهر رمضان فتحت أبواب السماء وغلقت أبواب جهنم،وسلسلت الشياطين ''[بخاری، الصوم، رقم:۸۹۸](جب رمضان آتا ہے، تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ،اور جہنم کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے)۔ایک دوسری حدیث میں ہے:''من قام رمضان إيماناً واحتساباً غفر له ماتقدم من ذنبه ''[بخاری ۳۷، ومسلم ۷۵۹](جس شخص نے رمضان کو ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت کے ساتھ عبادت میں گذارا، تو اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں)۔اس طرح کی بے شمار احادیث ہیں، جن سے رمضان کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس مہینے میں جس طرح نیکیاں کمانے کی ہم فکر کرتے ہیں اور مختلف اعمال انجام دیتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے؛ بلکہ یہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم خود کو تمام گناہوں سے بچائیں، اور کوئی بھی ایسا عمل نہ کریں، جس سے اللہ تعالی کی نافرمانی لازم آتی ہو، اس پہلو پر خاص طور سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

رمضان کے اعمال: روزہ رکھنا، بہت زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کرنا، بہت زیادہ صدقہ وخیرات کرنا، ہر دن تراویح کا اہتمام کرنا، اس سے پچھلے گناہ معاف ہوتے ہیں، روزہ داروں کو افطار کروانا، اس کا اجر روزہ رکھنے کے برابر ہے۔لیلۃ القدر کو پانے کے لئے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگ کر بہت زیادہ عبادت کرنا۔اس ماہ میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہے۔

روزہ کی اہمیت، فرضیت اور فضیلت:

یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔جان بوجھ کر ایک روزہ توڑنے والا اس کے بدلے زندگی بھر بھی روزے رکھے تو بھی پورا نہ ہوگا۔بلکہ وقت سے پہلے افطار کرنے والے کو جہنم میں سر کے بل لٹکایا جائیگا اور اس کا منہ پھاڑا جائیگا جس سے خون بہتا ہوگا۔ [بیہقی، ابن خزیمہ]اس کی فرضیت کو نہ ماننے والا مسلمان نہیں، جس پر تمام علماء امت کا اجماع ہے۔شعبان سن دو ہجری میں رمضان کے روزے فرض ہوئے۔اس کی فرضیت کی سب سے واضح دلیل سورہ البقرہ کی آیت ۱۸۳ ہے، اس کی فضیلت میں کئی حدیثیں ہیں جن میں سے تین کا خلاصہ بغور پڑھیں:

جنت کے ایک دروازہ کا نام ''الریان'' ہے، اس میں صرف روزہ دار ہی داخل ہونگے جب وہ داخل ہوجائیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر کوئی دوسرا داخل نہ ہوسکے گا۔ [بخاری ۱۸۹۶، مسلم ۲۵۱۱ بروایت سہل بن سعد]۔

جو شخص ایمان اور نیکی کی امید کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔[بخاری ۸۳، مسلم ۷۶۰ بروایت ابو ہریرہ]۔

اللہ تعالی کے راستے میں ایک دن کا روزہ رکھنے والے کے چہرے کو ستر سال کے لئے جہنم کی آگ سے دور رکھا جائے گا۔ [بخاری ۲۸۴۰، مسلم ۱۱۵۳ برایت ابو سعید خدری]۔

روزہ کے فائدے: گندے اخلاق، سطحی سوچ سے نفس کی پاکی، جس کی طرف اشارہ سورۃ البقرہ ۱۸۳ کے لفظ 'تتقون' میں ہے۔ خواہشات اور دنیا سے بے رغبتی، جس کی طرف اشارہ بخاری اور مسلم کی روایت میں شادی نہ کر سکنے والے نوجوانوں کو دیئے گئے روزہ رکھنے کی ترغیب میں ہے۔ مسکینوں اور کمزوروں کی حالت پر ترس کھانا اور ترحم کا جذبہ، جس کا ذکر ابو داود میں صدقہ فطر کے فائدہ میں آیا ہے۔

روزے کے سنن و مستحبات: j سحری کھانے کا اہتمام کرنا کہ اس میں بڑی برکت ہے [بخاری ۱۹۲۳]، سحری فجر کی اذان سے کچھ پہلے کھانی چاہئے اسی کی فضیلت ہے [بخاری ۱۹۲۵]۔ سورج غروب ہوتے ہی فوراً افطار کرنا [بخاری ۱۹۵۷]، تازہ کھجور یا خشک کھجور سے اور اگر یہ نہ ہو تو پانی سے افطار کرنا مستحب ہے [ترمذی ۶۹۶]، افطار کے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے: ''ذهب الظمأ وابتلت العروق وثبت الأجر إن شاء الله'' (پیاس بجھ گئی، رگیں سیراب ہو گئیں اور اگر اللہ نے چاہا تو اجر ضرور ملے گا) [ابو داود ۲۳۵۷] یا جو مشہور دعا ہے، وہ بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ اروزہ کی حالت میں بہت زیادہ دعا کرتے رہنا کیونکہ اس حال میں دعا رد نہیں کی جاتی [بیہقی]۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، فحش، ظلم و زیادتی سے زبان کی حفاظت کرنا، اگر کوئی جھگڑا یا فحش گوئی پر اتر آئے تو کہہ دینا کہ میں روزہ دار ہوں [بخاری ۱۹۰۴، مسلم ۱۱۵۱]۔ n روزہ صرف پیٹ کا ہی نہ ہو بلکہ کوشش کرے کہ دل، اور سارے اعضاء بدن کا روزہ ہو۔ سلف صالحین اس کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے چنانچہ حضرت جابر فرماتے ہیں: جب تم روزہ رکھو تو چاہئے کہ تمہارا کان، آنکھ، جھوٹ اور محرمات سے زبان بھی روزہ رکھے، پڑوسی کو تکلیف دینا چھوڑ دو، روزہ والے دن تمہارے اوپر وقار و سکینت چھایا رہے اور روزے کا دن دوسروں دنوں سے ممتاز ہو۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے:

(۱) کان اور ناک میں دوا ڈالنا، (۲) قصداً منہ بھر قے کرنا، (۳) کلی کرتے ہوئے حلق میں پانی چلا جانا، (۴) عورت کو چھونے وغیرہ سے انزال ہو جانا، (۵) کوئی ایسی چیز نگل جانا جو عادۃً کھائی نہیں جاتی، جیسے لکڑی، لوہا، گیہوں کا دانہ وغیرہ، (۶) بھول کر کھا پی لیا اور یہ خیال کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ گیا ہوگا، پھر قصداً کھا پی لیا، (۷) رات سمجھ کر صبح صادق کے بعد سحری کھالی، (۸) دن باقی تھا؛ مگر غلطی سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے، روزہ افطار کر لیا۔

تنبیہ: ان سب چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مگر صرف قضا واجب ہوتی ہے، کفارہ لازم نہیں ہوتا۔

- جان بوجھ کر کھا پی لینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اس صورت میں کفارہ اور قضا دونوں لازم ہیں۔
- دانتوں میں گوشت یا کھانے کا کوئی حصہ رہ گیا اور روزہ کی حالت میں انسان نے نگل لیا تو اگر وہ چنے کے دانے کے برابر ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہوگی اور اگر چنے کے دانے سے کم ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔
- وضو کرتے وقت یا نہاتے وقت اگر غلطی سے پانی حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اس صورت میں صرف قضا لازم ہے، اسی بنا پر انسان کو چاہیے کہ روزہ کی حالت میں فرض غسل کرتے وقت بھی نہ تو غرارہ کرے اور نہ بہت زیادہ ناک میں پانی ڈالے، کیوں کہ اس سے روزہ ٹوٹ جانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔
- اگر کسی نے زبردستی کچھ کھلا دیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور صرف قضا لازم ہوگی کفارہ نہیں، البتہ کھلانے والا گنہگار ہوگا۔
- دانتوں یا مسوڑوں سے خون نکل کر حلق میں چلا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہوگی۔

- روزہ کی حالت میں بیوی سے ہم بستری کرنے سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس صورت میں کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوں گے۔
- اگر ہم بستری نہیں کی، صرف بوسہ لیا اور اِنزال ہو گیا تو اس صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم ہوگی۔
- اگر کسی مرد نے ہاتھوں سے انزال کر لیا تو اس صورت میں صرف قضا لازم ہوگی۔
- اسی طرح اگر کسی شخص نے عورت کو شہوت سے دیکھا یا چھوا اور انزال ہو گیا تو اس صورت میں بھی صرف قضا لازم ہوگی۔
- اگر کسی نے قصداً منہ بھر کر قے (اُلٹی) کی تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، یا پھر اگر خود بخود قے آئی اور پھر اس نے جان بوجھ کر اندر نگل لی تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا۔
- روزہ کی حالت میں سگریٹ یا حقہ پینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔
- اگر کسی کی نکسیر پھوٹ گئی اور خون حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر خون حلق میں نہیں گیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹتا نہیں؛ مگر مکروہ ہوجاتا ہے: (۱) بلاضرورت کسی چیز کو چبانا یا نمک وغیرہ چکھ کر تھوک دینا، ٹوتھ پیسٹ یا منجن یا کوئلہ سے دانت صاف کرنا بھی روزہ میں مکروہ ہیں۔ (۲) تمام دن حالت جنابت میں بغیر غسل کیے رہنا۔ (۳) غیبت یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا، یہ ہر حال میں حرام ہے، روزہ میں اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے۔ (۴) روزہ میں لڑنا جھگڑنا، گالی دینا خواہ انسان کو ہو یا کسی بے جان چیز کو یا جاندار کو، ان سے بھی روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

اگر کسی نے روزہ کی حالت میں بھول کر کھا پی لیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ روزہ کی حالت میں تھوک نگلنے سے بھی روزہ پر فرق نہیں پڑتا، البتہ جان بوجھ کر تھوک کو جمع کر کے نگلنا مکروہ ہے۔ روزہ کی حالت میں مسواک (چاہے خشک ہو یا تر) کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں اگر غسل کرتے ہوئے کان میں خود بخود پانی چلا گیا تو روزہ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس لیے کہ یہ اختیار سے باہر ہے۔ روزہ کی حالت میں خود سے قے (اُلٹی) آجانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں دانتوں سے خون نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، بشرطیکہ خون حلق میں نہ جائے، اگر خون حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ یا کاجل لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں سر یا پورے جسم پر تیل لگانے اور مالش کرنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں بیوی سے معانقہ کرنے یا بوسہ لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، مگر پھر بھی اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ روزہ کی حالت میں اگر احتلام ہو جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، چاہے انجکشن گوشت میں لگایا جائے یا رگ میں۔ گلوکوز کی بوتل (drip) لگانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ بغیر کسی مجبوری کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ روزہ کی حالت میں جسم کے کسی حصے سے، کسی بھی مقدار میں خون نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں کسی کو خون دینے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزہ کی حالت میں دانت نکلوانے سے روزہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، بشرطیکہ خون حلق میں نہ جائے۔ روزہ کی حالت میں آنکھ میں دوائی ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن جدید میڈیکل سائنس کی تحقیق کے مطابق آنکھ میں ڈالی گئی سیال دوائی کا ذائقہ چوں کہ حلق میں محسوس ہوتا ہے، اس لیے احتیاط کے پیش نظر روزے کی حالت میں (بغیر کسی مجبوری کے) آنکھ میں دوائی ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

وہ چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور مکروہ بھی نہیں ہوتا: (۱) مسواک کرنا۔ (۲) سر یا مونچھوں پر تیل لگانا۔ (۳) آنکھوں میں دوا ڈالنا یا سرمہ لگانا۔ (۴) خوشبو سونگھنا۔ (۵) گرمی اور پیاس کی وجہ سے غسل کرنا۔ (۶) کسی قسم کا انجکشن یا ٹیکہ لگوانا۔ (۷) بھول کر کھانا پینا۔ (۸) حلق میں یا بلاقصد پانی کا چلا جانا۔ (۹) خود بخود قے آجانا۔ (۱۰) سوتے ہوئے احتلام (غسل کی حاجت) ہو جانا۔ (۱۱) دانتوں میں

سے خون نکلے؛ مگر حلق میں نہ جائے تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

نماز تراویح کا حکم: تراویح کی نماز مردوں اور عورتوں کے لیے مسنون ہے، جماعت سے تراویح پڑھنا سنت کفایہ ہے اور تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد ہے اور تراویح پر وتر کا مقدم کرنا بھی صحیح ہے اور مؤخر کرنا بھی۔ تہائی رات تک تراویح کو موخر کرنا مستحب ہے، اور صحیح مذہب کے بموجب نصف شب کے بعد تراویح کا موخر کرنا مکروہ نہیں ہے۔ تراویح کی بیس رکعت ہیں دس سلاموں کے ساتھ، اور ہر چار رکعت کے بعد ان چار رکعات کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے۔ تراویح مردوں اور عورتوں سب کے لئے سنتِ موکدہ ہے۔ مگر عورتوں کے لئے جماعت سنت موکدہ نہیں۔

عورتیں بھی اگر تراویح کو بلا عذر ترک کر دیں، تو ترکِ سنت کا گناہ ہوگا۔ (نور الایضاح ۹۹، کفایۃ المفتی ج ۳، ص ۳۶۱)۔

عورتوں کو یہ نماز گھر میں پڑھنی چاہئے اور مردوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت ہے، اگر کسی محلے یا گاؤں کی مسجد میں کوئی شخص بھی نماز تراویح جماعت سے نہ پڑھے، تو پورے محلے اور گاؤں والے سنت چھوڑنے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔ (عالمگیری ۱/۱۱۶)

اعتکاف: (۱) اعتکاف اس کو کہتے ہیں کہ اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں رہے اور سوائے ایسی حاجات ضروریہ کے جو مسجد میں پوری نہ ہوسکیں (جیسے پیشاب، پاخانہ کی ضرورت یا غسل واجب اور وضو کی ضرورت) مسجد سے باہر نہ جائے۔ (۲) رمضان کے عشرۂ اخیر میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ یعنی اگر بڑے شہروں کے محلّہ میں اور چھوٹے دیہات کی پوری بستی میں کوئی بھی اعتکاف نہ کرے تو سب کے اوپر ترکِ سنت کا وبال رہتا ہے اور کوئی ایک بھی محلّہ میں اعتکاف کرے تو سب کی طرف سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ (۳) بالکل خاموش رہنا اعتکاف میں ضروری نہیں؛ بلکہ مکروہ ہے؛ البتہ نیک کلام کرنا اور لڑائی جھگڑے اور فضول باتوں سے بچنا چاہیے۔ (۴) اعتکاف میں کوئی خاص عبادت شرط نہیں، نماز، تلاوت یا دین کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا یا جو عبادت دل چاہے کرتا رہے۔ (۵) جس مسجد میں اعتکاف کیا گیا ہے، اگر اس میں جمعہ نہیں ہوتا، تو نماز جمعہ کے لیے اندازہ کر کے ایسے وقت مسجد سے نکلے جس میں وہاں پہنچ کر سنتیں ادا کرنے کے بعد خطبہ سن سکے۔ اگر کچھ زیادہ دیر جامع مسجد میں لگ جائے، جب بھی اعتکاف میں خلل نہیں آتا۔ (۶) اگر بلا ضرورت طبعی شرعی تھوڑی دیر کو بھی مسجد سے باہر چلا جائے گا تو اعتکاف جاتا رہے گا، خواہ عمداً نکلے یا بھول کر۔ اس صورت میں اعتکاف کی قضا کرنا چاہیے۔ (۷) اگر آخر عشرہ کا اعتکاف کرنا ہو تو ۲۰/ تاریخ کو غروبِ آفتاب سے پہلے مسجد میں چلا جائے اور جب عید کا چاند نظر آجائے تب اعتکاف سے باہر ہو۔ (۸) غسلِ جمعہ یا محض ٹھنڈک کے لیے غسل کے واسطے مسجد سے باہر نکلنا مُعتکف کو جائز نہیں۔

شبِ قدر: چونکہ اس امت کی عمریں بہ نسبت پہلی امتوں کے چھوٹی ہیں؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک رات ایسی مقرر فرمادی ہے کہ جس میں عبادت کرنے کا ثواب ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے بھی زیادہ ہے؛ لیکن اس کو پوشیدہ رکھا؛ تاکہ لوگ اس کی تلاش میں کوشش کریں اور ثواب بے حساب پائیں۔ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شبِ قدر ہونے کا زیادہ احتمال ہے یعنی ۲۱ ویں، ۲۳ ویں، ۲۵ ویں، ۲۷ ویں، ۲۹ ویں شب۔ اور ۲۷ ویں شب میں سب سے زیادہ احتمال ہے۔ ان راتوں میں بہت محنت سے عبادت اور توبہ واستغفار اور دعا میں مشغول رہنا چاہیے۔ اگر تمام رات جاگنے کی طاقت یا فرصت نہ ہو تو جس قدر ہو سکے جاگے اور نفل نماز یا تلاوتِ قرآن یا ذکر و تسبیح میں مشغول رہے اور کچھ نہ ہو سکے تو عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کا اہتمام کرے، حدیث میں آیا ہے کہ یہ بھی رات بھر جاگنے کے حکم میں ہو جاتا ہے، ان راتوں کو صرف جلسوں تقریروں میں صرف کر کے سو جانا بڑی محرومی ہے، تقریریں ہر رات ہو سکتی ہیں، عبادت کا یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

البتہ جو لوگ رات بھر عبادت میں جاگنے کی ہمت کریں، وہ شروع میں کچھ وعظ سن لیں، پھر نوافل اور دعا میں لگ جائیں تو درست ہے۔

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(آخری قسط)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

احساس ذمہ داری :

مولاناؒ کی شخصیت جامعیت کا بہترین نمونہ تھی علمی مزاج ،ادبی ذوق ،تصنیف وتالیف کا مشغلہ ،زہدو ورع اور بے مثال استغنا کے ساتھ ملی قیادت اور سماج سے رشتہ بلکہ ملی مسائل سے دل چسپی ان کا خاصہ تھا،ذیل کے اقتباس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا ملک ومعاشرہ اور ملت کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ذمہ داری کا کیسا احساس رکھتے تھے:۔

یہ ''کاروان زندگی'' (خواہ وہ ایک شخصی وانفرادی سوانح حیات یا سرگذشت کی صورت میں ہو) چونکہ زیر زمین (UNDER GROUND) یا سرنگ میں سے نہیں گزرتا بلکہ بالائے زمین، زندہ وآباد متمدن وترقی یافتہ اور سیاسی وانتظامی طور پر ایک آزاد اور خودمختار ملک میں اپنا سفر اس طرح طے کر رہا ہے کہ آنکھ کان بھی اپنا کام کر رہے ہیں اور دل ودماغ بھی اپنا فرض انجام دیتے ہیں، پھر دین ومذہب کی تعلیمات ،صحیفۂ آسمانی اور سیرت وتعلیمات نبوی نے اسباب سے مسببات اور واقعات ومشاہدات نے نتائج تک پہونچنے کی عادت وصلاحیت بھی پیدا کردی ہے۔

اس کے ساتھ (خوش قسمتی یا بدقسمتی سے) تاریخ عالم اور سرگذشت اقوام وامم پر بھی کم وبیش نظر ہے اور ان کے عروج و زوال اور اس کے اسباب وعلل سے بھی کسی حد تک واقفیت ہے،اس لئے واقعات ومشاہدات سے سرسری طور پر گذر جانا اور حقائق کو نظر انداز کرنا نہ مصنف کے لئے ممکن ہے اور نہ اس کی ایک محبّ وطن ،صاحب ایمان اور بہی خواہ انسانیت کے لئے کوئی جواز یا گنجائش ہے۔(کاروان زندگی ج۶۔ص۱۴۲۔۱۴۳)

اقدامی کاروائی:

مولانا کی بصیرت اور ان کی مومنانہ جرأت ان کو اقدامی کاروائی کے لئے آمادہ کرتی تھی، اور بسا اوقات جب حالات بہت ناگزیر ہوجاتے ہیں تو فراست ایمانی اور جرأت مومن ہی ملت کی کشتی کو کنارے لگاتی ہے، اگر ہر جگہ دفاعی پوزیشن اختیار کی جائے اور کچھ کرنے سے صرف اس لیے ڈرا جائے کہ کہیں اس کا اثر غلط ہوجائے اور ممکن ہے کہ نقصان بڑھ جائے، تو اس کے بہت سے نقصانات کے علاوہ سب بڑا نقصان یہ ہے کہ ملت رفتہ رفتہ دفاع کے قابل بھی نہیں رہتی اور استحصالی ذہن رکھنے والے ایسے مواقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں، حضرت مولاناؒ چہار جانب نظر رکھتے تھے اور ملت کی فکر میں گھلتے تھے اور پھر ان کی شخصیت اخلاص میں دھلے ہوئے اقدامات سے اس قدر مؤثر ہوگئی تھی کہ بڑے سے بڑا فیصلہ لینے میں تأمل نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حکومت کے ایک ناعاقبت اندیش موقف کی یوں گرفت کی!

''یہ صورت حال ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم کو اپنے بچوں کا ان تعلیم گاہوں کے فوائد اور سہولتوں سے محروم رکھنا گوارہ ہے لیکن ان کے ایمان، دینی احساسات اور شعور کو خطرہ میں ڈالنا اور مشرکانہ اعمال میں شریک ہونا کسی قیمت پر گوارہ نہیں''

(ندائے ملت ۲۰؍جولائی ۱۹۶۲ء)

اس مومنانہ فراست، عالمانہ بصیرت قیادت کی جرأت مندانہ گرفت اور فیصلہ کا بروقت نتیجہ خیز اثر یہ ہوا کہ محکمہ تعلیم نے اپنی تمام ہدایات کو واپس لے لیا۔

اسی طرح ۱۹۹۷ء میں جب حکومت اتر پردیش نے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اسکولوں میں ''وندے ماترم'' کو نافذ کیا اور بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانا لازمی قرار دیا تو اس موقع پر بھی مفکر اسلام نے اپنے اضطراب و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور ہی سے ایک محبّ وطن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے'' (خطبۂ صدارت علی گڑھ، اپریل ۱۹۹۸ء)

حکومت کے اس فیصلہ کا مفکر اسلام کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر تھا کہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ندوۃ العلماء میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے پوری جرأت و استقامت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ:

''اگر یہ صورت حال باقی رہتی ہے اور حکومت کی طرف سے وندے ماترم اور پھول چڑھانے کا غیر اسلامی فیصلہ تبدیل نہ کیا گیا تو ایسے تمام اسکولوں سے مسلمان اپنے بچوں کو نکال لیں گے۔ ہمارے لئے تعلیم سے زیادہ عقیدۂ توحید اور دین کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے'' (تکبیر مسلسل)

حمیت و حمایت:

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دینی حمیت اس حد تک پائی جاتی تھی کہ وہ انہیں ہر دینی و ملی ضرورت کا احساس دلا دیتی تھی، حمایت سے دور وہ اسی حمیت کے قائل تھے، جس میں جذبۂ دروں کارفرما ہو، اور جس سے جنونی کیفیت اس طرح پیدا ہو، کہ وہ کسی دینی و ملی تعمیر کا ذریعہ بن جائے، حمایت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں، لیکن حمیت کا ہونا کمیاب ہے، حضرت مولانا نے اپنے ایسے رفیق جن سے طویل رفاقت رہی اور نہ صرف یہ کہ طویل رفاقت رہی بلکہ فکر و عمل میں یکسانیت کی بھی ایسی نظیر ملنا مشکل ہے، یعنی مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے تعزیتی جلسہ میں مولانا کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جملے ارشاد فرماتے ہیں جس طرح یہ دونوں عارفین بہت سی خصوصیات و اعمال و افکار میں متحد نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ خصوصیت بھی دونوں میں بدرجہ اتم یکساں نظر آتی ہیں، جو ایک رفیق نے دوسرے رفیق کے لئے لکھی ہے، یہ بات بہت پتے کی ہے، اور ضرورت ہے کہ ہر ایک میں پیدا ہو اور اس کے حصول کے لئے ضروری تگ و دو کے ساتھ خدا سے اس کی توفیق طلب کی جائے، ذرا ان جملوں سے قلب کو متحرک اور دماغ کو روشن کیجئے:

''مولانا کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی حمیت دینی ہے، ایک ہے ''حمایت'' دوسری چیز ہے ''حمیت'' حمایت میں وہ اندرونی جذبہ اور دل سوزی نہیں ہوتی، وہ دل کی تپش اور ذہن کی خلش اور وہ اضطراب و بے چینی نہیں ہوتی جو حمیت میں ہوتی ہے، حالانکہ حروف دونوں کے متقارب ہیں، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت دینی کا جو جوہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے، ہوسکتا ہے دینداری، عبادت گذاری، تہجد اور شب بیداری اور ذکر و شغل میں دوسرے لوگ بڑھے ہوئے ہوں لیکن دینی غیرت و حمیت کی دولت و نعمت سے مولانا مالا مال تھے، حمیت یہ ہے کہ دل میں آگ سی لگ جائے، سوزش پیدا ہوجائے کہ کیا ہو رہا ہے، کیا خطرات درپیش ہیں، مسلمانوں کی آبادی کا کیا حشر ہوگا، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کا کیا انجام ہوگا۔'' (کاروان زندگی ج ۷ ص ۳۰)

بے لوثی اور مال و زر سے دوری:

حضرت مولاناؒ کی جرأت تنقید اور کمزوریوں کی نشاندہی میں

شاید سب سے بڑا دخل آپ کی بے لوثی کا ہی تھا، جس کے متعدد واقعات لوگوں کے دیدہ وشنیدہ ہیں اور اس کتاب میں نقل کئے گئے ہیں، فرمائش خود کے لئے تو دور ندوۃ العلماء کے لئے بھی کبھی نہیں کی، معاوضوں اور تحائف کو آسانی سے قبول نہیں کیا، انعامات و ایوارڈ کی شکل میں دی گئی رقموں کو دعوت واسلامی تعلیمات کو عام کرنے والے اداروں میں تقسیم کر دیا، متعدد واقعات نقل کرنے کے باوجود بھی دل چاہتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے اپنی کتاب ''میر کارواں'' میں اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے اسے من وعن نقل کردوں کہ وہ تحریر اس ضمن میں مختصر وجامع ہے:

''مولاناؒ کی اقتصادی حالت شروع سے متوسط درجے کی رہی جس کو اہل عرب ''مستور الحال'' کہتے ہیں، اگر چہ کبھی رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی میں فرق نہیں آیا، مگر' دولت مندی' کی حالت کبھی نہیں تھی۔ مولاناؒ کے والد ماجد علیہ الرحمۃ کا مشغلہ طب تھا۔ طبابت کی آمدنی سے گذر بسر ہو جاتی تھی، والدہ ماجدہ زمیندار گھر کی بی بی تھیں، مگر ایسی زمینداری بھی نہیں جو رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی ہو۔

مولاناؒ کے والد ماجد علیہ الرحمۃ نے لکھنؤ میں اپنا کوئی مکان نہیں بنایا۔ کرایہ کے مکان (۳۷ گوئن روڈ) میں رہے اور آپ کے بعد آپ کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب علیہ الرحمۃ اور آپ کا پورا خاندان جس میں حضرت مولانا علی میاں مدظلہ بھی ہیں۔ اسی مکان میں رہے۔ اسی مکان میں آپ کا مطب تھا۔ اسی سے متصل مسجد بھی تھی جو آج بھی ہے، ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا کوئی مکان نہیں بنایا، غالبا سوچا بھی نہیں۔ ۶۵ سال اس مکان میں یہ خاندان آباد رہا۔ اس مختصر سے مکان میں بڑی برکت اور نورانیت تھی۔ اس میں بارہا حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ٹھہرے، اور وقت کے بڑے بڑے علماء بھی اس مکان میں آتے رہے، حضرت تھانویؒ نے بھی قدم رنجہ فرمایا، غیر متعلق لوگوں کو (جن میں کاتب الحروف بھی ہے) یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے۔ بالآخر حضرت مولاناؒ کے زمانہ میں جب مالک مکان نے اس کو خالی کرانے کا مطالبہ کیا تو مولاناؒ نے اپنے افراد خاندان کو حکم دیا کہ مکان خالی کر دیں۔ ۶۵ سال قبضہ میں رہنے کے بعد کوئی دوسرا ہوتا تو مکان آسانی سے نہیں چھوڑتا، اور نہ معلوم کتنی مدت تک مقدمہ چلتا اور پھر ایک خطیر رقم لینے کے بعد مکان خالی ہوتا، بہر حال یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولاناؒ ان لوگوں میں نہیں تھے، جن کو مال کی ضرورت ہی نہ ہو۔ مولاناؒ نے کاروان زندگی کے پہلے حصہ میں اپنی اقتصادی حالت کی ابتری کا ذکر فرمایا ہے۔

ایسے شخص کو اگر حلال طریقہ سے ہدایا کی بڑی رقم ملے اور وہ بھی ایک نہیں کئی بار، تو اس کو چھوڑنا اور واپس کر دینا، اس زمانہ میں عقل مندی کا طریقہ نہیں ہے، اگر کسی کے اتنے تعلقات ہوں اور چوٹی کے مالداروں سے سابقہ ہو اور ان کی خواہش بھی ہو کہ کچھ فرمائش کریں تو اس کو پوری کرنے میں سعادت ومسرت محسوس کریں، مگر مولاناؒ کی ''عقلیت'' نے کیا کیا اس کی مختصر روداد اس سے سنئے جس کے لئے یہ واقعات شنیدہ نہیں دیدہ ہیں، اور اس کا وہ چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ درمیان کا آدمی بھی رہ چکا ہے۔

محرم ۱۳۷۰ھ میں جب کہ مولاناؒ حجاز میں مقیم تھے۔ حضرت رائے پوریؒ حج سے فارغ ہو کر ہندوستان تشریف لے جا چکے تھے، مولاناؒ اور ان کے رفقاء وخدام کا قیام کسی ہوٹل یا محل میں نہیں بلکہ عام مسافروں کی جائے پناہ ''رباط'' میں تھا۔ کھانا صرف دن کا کھایا جاتا تھا۔ بازار سے روٹی اور فول آتا اور سب مل کر ناشتہ کرتے، اور مولوی محمد طاہر صاحب ندوی مظاہری (جو بعد میں حضرت ڈاکٹر صاحب کے خویش ہوئے اور اب دفتر نظامت کے ناظر اعلیٰ ہیں) کوئی سبزی یا گوشت پکا لیتے، دوسرا ساتھی کوئی بازار سے سودا سلف لاتا، کوئی برتن دھوتا، اور سب مل کر کھاتے اس زمانہ میں ''رباط'' میں

جہاں بڑے بڑے لوگ عام طور سے جایا بھی نہیں کرتے ،مولانا سے ملنے کے لئے امام حرم شیخ عبد الرزاق حمزہ،مشہورا دیب و صاحب قلم استاذ احمد عبدالغفور عطار،شیخ عبدالقدوس انصاری ایڈیٹر النہل ،سید علی حسن فدعق (مفتش مالیات)اوراسی قبیل کے لوگ آیا کرتے تھے ۔ایک روز خود شیخ عمر بن حسن بھی ناشتہ میں شریک ہوئے ،اس زمانہ میں شیخ عمر کا درجہ وہی تھا جو آج کل شیخ بن باز کا ہے،ملک فیصل کے ماموں ہوتے تھے آل شیخ میں تھے۔ھیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے رئیس اعلی تھے،ملک سعود مرحوم کے ساتھ طواف وسعی میں ساتھ رہتے تھے،ان کا ''رباط'' میں آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی گورنر کسی جھونپڑے میں قدم رنجہ فرمائے ۔شیخ عمر بن حسن آل شیخ نے مولانا کے چند رسائل بین الصورۃ والحقیقۃ، بین الانسانیۃ وأصدقائھا ، بین الھدایۃ والجبایۃ دیکھے تھے اور الی ممثلی البلاد العربیہ بھی پڑھ چکے تھے اس وقت تک ماذا خسر مصر سے چھپ کر نہیں آئی تھی، انھوں نے ایک روز مجھ سے حرم میں فرمایا کہ صبح میرے پاس آنا،ان کے حکم کے مطابق حاضر ہوا تو ایک تھیلی سونے کی گنیوں سے بھری دی اور کہا کہ شیخ ابوالحسن کو پہونچا دو،اس زمانہ میں نوٹ کا چلن نہیں ہوا تھا ،یا تو چاندی کے ریال چلتے تھے یا چالیس ریال قیمت کی ایک طلائی گنی (جس کو جنیہ سعودی کہا جاتا تھا)، میں نے ایک تھیلی سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی ،اس کو لے کر ایک طرح کی خوشی کے ساتھ'' رباط'' آیا،حضرت مولاناؒ کی خدمت میں پیش کی ،غالبا ۴۵ منٹ یا ایک گھنٹہ بعد مولاناؒ نے ایک خط لکھا تھا اور تھیلی کے ساتھ مجھے دیا کہ شیخ کو دے آؤ،اس خط میں شکریہ کے جذبات احترام کے اظہار کے بعد یہ لکھا کہ ہدیہ قبول ہے اور میں نے ایک گنی اپنے ذاتی خرچ کے لئے رکھ لی ہے،بقیہ واپس کر رہا ہوں (بقیہ ۳۹ گنیاں) میں یہ رقم اور خط لے کر گیا تو شیخ ظہر کے بعد آرام کر رہے تھے،ملاقات نہ ہو سکی ،بعد عصر گیا تو وہاں پورا ہال بھرا تھا،قہوہ کا دور چل رہا تھا،سلام کر کے خط اور رقم کی تھیلی حاضر کی ،شیخ نے پہلے خط پڑھا، پھر آواز سے اسے پڑھ کر سب کو سنایا،ایک صاحب نے کہا علماء سلف کے نمونے ہر زمانہ میں مل جاتے ہیں ،ایک اور صاحب بولے ''لاتزال أمة محمد علی خیر ''(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہمیشہ خیر رہا ہے) پچاس برس پہلے کی بات ہے،ان لوگوں نے نجدی لہجہ میں اور کیا کہا یاد نہیں،لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے اس استغنا سے ہندوستان کے علماء کا وقار بڑھ گیا ،اور محسوس کیا گیا کہ سب یکساں نہیں ہوتے ،میں سمجھا تھا کہ بات ختم ہوگئی مگر عرصۂ دراز کے بعد شیخ عمر بن حسن کے برادرزادہ شیخ حسن بن عبداللہ آلِ شیخ (جو بعد میں وزیر تعلیم ہوئے اور پھر وزیر تعلیم اعلیٰ ہوئے) سے بیروت میں استاذ عبد اللہ الغنیم کے مکان پر ملاقات ہوئی تو انھوں نے مولاناؒ کی خیریت معلوم کی اور اس واقعہ کو میری موجودگی میں عبداللہ الغنیم کو سنایا،اسی زمانہ کا دوسرا واقعہ امیر سعود الکبیر (بادشاہ کے چچا) کے ہدیہ کا ہے۔موصوف نے مولاناؒ اور ان کے مرافقین کی دعوت کی ،کھانے اور چائے کے بعد واپس آنے لگے تو مولوی رضوان علی صاحب (حال ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی مقیم کراچی) کو اشارہ سے روک لیا ،اور ان کے ساتھ چاندی کے ریالوں کی بڑی تھیلی جس میں پانچ سو ریال تھے ان کے حوالہ کی اور کہا اپنے شیخ کو دے دینا،وہ تھیلی بھی واپس کی گئی ،تفصیل معلوم نہیں کیوں کہ اس دعوت کے موقع پر میں موجود نہیں تھا،غالبا سعودی ریڈیو کے اردو سروس کے انچارج حکیم محمد نعیم صاحب مرحوم نے اپنی قیام گاہ حجاج منزل جدہ میں کچھ ترجموں کے لئے بلالیا تھا۔

تیسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ مولاناؒ سے سعودی ریڈیو نے چند تقریریں ریکارڈ کرائیں۔من العالم الی جزیرۃ العرب اور

من الجزیرہ الی العالم وغیرہ۔محکمۂ ریڈیو کے انچارج اس وقت شیخ محمد سرور الصبان تھے، جو اس وقت نائب وزیر مال تھے (بعد میں وزیر مال ہوئے آخر میں رابطہ عالم اسلامی کے پہلے جنرل سیکریٹری) شیخ محمد سرور الصبان نے تقریروں کا معاوضہ (خصوصی) پیش کیا تھا ،مگر مولانا نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

شیخ محمد سرور الصبان کے بہت قریبی حلقے کے ایک ادیب و صاحب قلم استاذ احمد عبدالغفور عطار نے ہم لوگوں سے کہا کہ شیخ ابو الحسن جیسی شخصیت ''رباط'' میں رہے اچھا نہیں معلوم ہوتا ،تم اس مضمون کا ایک خط شیخ کی طرف سے محمد سرور الصبان کو لکھو وہ فندق التیسیر (جو اس وقت مکہ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا) کو آرڈر دے دیں گے وہاں چار پانچ کمرے معہ خورونوش کے مل جائیں گے، ہم لوگ مولانا کے مزاج سے واقف تھے، اس لئے ان سے کہہ دیا کہ وہ اس وقت بھی قبول نہیں فرمائیں گے، جب خود ان کی طرف سے پیش کش ہو چہ جائیکہ وہ اس کی درخواست کریں۔

ملک سعود کے بعد ملک فیصل تخت نشین ہوئے ،اس وقت مولانا کی کئی مرتبہ ملک فیصل سے تنہائی میں ملاقات ہوئی ، ہر مرتبہ مولانا نے وہی باتیں کیں جن کا تعلق دینی شعور کی بیداری اور دولت کی فراوانی سے پیدا شدہ مسائل اور امریکہ کی تقلید سے تھا، جس کی تفصیل کاروان زندگی میں ہے۔اپنی ذات یا ندوہ کے لئے ایک ہلکا سا اشارہ لاکھوں لاکھ کی دولت یہاں لاسکتا تھا، ۱۹۵۵ء میں مولانا کو دمشق یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دعوت دی گئی (جس کی تفصیل عالم عرب سے تعلقات کے باب میں آئے گی) یہاں صرف یہ ذکر کرنا ہے کہ مولانا نے اپنے محاضرات کا کوئی معاوضہ حکومت شام سے قبول نہیں کیا، اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ان خطبات کا مجموعہ رجال الفکر و الدعوۃ جب شائع ہوا تو الاستاذ مصطفیٰ السباعی نے اپنے مقدمہ میں اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ یونیورسٹی) نے ۱۳۸۹ء کے جلسے میں طے کیا کہ ممبروں کو ایک ''اکرامیہ'' کے نام سے رقم دی جایا کرے (علاوہ سفر خرچ اور ضیافت کے) مولانا نے اس کو قبول نہیں فرمایا، اور جامعہ کی طرف سے جو ہوٹل میں رہائش کی سہولت دی جاتی تھی وہ بھی قبول نہیں فرمائی ،اپنے محبّ ومخلص میزبان شیخ محمد نور ولی کی میزبانی (قیام کی) قبول فرمائی ،اور ان کے باغ والے مکان میں قیام کرتے رہے،اور جب وہ باغ بلڈنگ میں تبدیل ہو گیا تو ان کے ذاتی ملکیت کے ہوٹل میں ٹھہرا کئے ۔اور اب حرم شریف سے متصل ایک متوسط درجہ کا ہوٹل قصر الشریف ہے جس میں قیام رہتا ہے، شیخ ابن باز جب تک یونیورسٹی کے چانسلر رہے وہ باغ نور ولی میں ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے، اور اسی باغ میں مولانا سے ملنے کے لئے شیخ محمود احمدؒ (برادر حضرت مدنیؒ) تشریف لاتے اور عرب، غیر عرب اساتذہ وطلبہ آتے رہے۔

رابطہ عالم اسلامی کے مستقل ممبروں نے بھی یہ تحریک اٹھائی کہ ان کو ایک ''اکرامیہ'' دیا جائے ۔مولانا نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ کوئی کام تو ہم لوگ خالص دین کے لئے کریں ،مگر لوگوں نے اصرار کیا، اور یہ تجویز پاس ہوگئی ،اس میں مولانا کی ذات اور کویت کے رئیس کبیر شیخ عبداللہ علی المطوع کا استثناء ہے۔

اور اگر مولانا کا ایماء ہوتا تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔یہی حال سعودی عرب کے عمائد، وزیروں سے ملنے کے وقت اور کسی نجی یا اجتماعی گفتگو میں رہا کبھی ایک اشارہ بھی چندہ کی طرف نہیں کیا، اگر چہ بعد میں جو ہوا مولانا ہی کے نام پر ہوا۔اور ان اپیلوں کا اثر ہوا، جو کسی کے نام نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے نام تھیں۔

یہ ایک رخ تھا، اہل دین اور علماء کے ساتھ معاملہ کا، دوسرا رخ یہ ہے کہ ملک عبداللہ بن حسین والئی اردن نے ایک رقم دی مولانا

نے یہ رقم قبول کرنے سے عذر کیا تو ایوان شاہی کے بعض حضرات نے کہا کہ بادشاہ کا ہدیہ رد نہیں کیا جاتا تو آپ نے پوری رقم فلسطین فنڈ میں دے دی جس کے شاہ عبداللہ صدر تھے۔ ملک فیصل ایوارڈ کی رقم مکۂ مکرمہ میں قائم شدہ فنڈ برائے جہاد افغانستان کے لئے نصف، اور نصف مدرسہ صولتیہ اور تحفیظ القرآن کو دے دی، ایک پیسہ اپنے لئے قبول نہیں فرمایا۔

یہ اس شخص کے استغناء کا حال ہے جس کے بارے میں استاذ احمد عبدالغفور عطار نے اپنی ریڈیائی تقریر میں کہا تھا کہ شیخ ابوالحسن کا لباس وزن اور قیمت دونوں کے لحاظ سے ہلکا ہوتا ہے۔ (خفیف الوزن والثمن) ضرورت رہتے ہوئے استغناء کا یہ عالم اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مقبول ہے۔ اور اس کے نیک بندوں کے یہاں بھی اس کی قیمت ہے۔ اور یہ سب اسی عقلیت کا نتیجہ ہے جس کی تفصیل وشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد الٰہی

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ مال سے نفرت رکھتے ہوں، یا اس سے الرجک ہوں، جب حضرت رائے پوریؒ کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ مولانا کو اصرار کے ساتھ کرایہ کی رقم دلوا دیا کرتے تھے، (روایت مولوی عبدالمنان صاحب مرحوم خادم حضرت رائے پوریؒ)، جب دوسرے حج میں تشریف لے گئے ہیں جس میں حضرت رائے پوریؒ کا ساتھ تھا، اور حج بدل تھا، (حضرت شیخ الحدیث کی ایک صاحبزادی کی طرف سے) جب حج ختم ہو گیا تو حضرت رائے پوریؒ نے کہا ''بس اب شیخ کی ضیافت اور انتظام ختم ہوا (اشارہ تھا کہ حج بدل کے سلسلہ میں جو اخراجات حضرت شیخ الحدیث نے دئے تھے اس کا وقت ختم ہوا) اب تم ہمارے ساتھ رہو گے''، حضرت نے ہوائی جہاز سے مدینہ منورہ کے سفر کا فیصلہ فرمایا اور مولانا کا ٹکٹ اپنی طرف سے لیا۔

مدرسہ صولتیہ میں مولانا حکیم محمد یامین صاحبؒ مولانا شمیم صاحب مرحوم کے پھوپھا مقیم تھے اور مدرسہ کی خدمات بھی ان کے سپرد تھیں، مدرسہ کے کتب خانہ کے نگراں تھے، انھوں نے پانچ ریال ایک لفافہ میں بند کر کے دیئے اور لکھا کہ اخلاص کے آنسو سے بہایا ہوا یہ ہدیہ قبول کریں، مولانا نے بہت شکر گذاری کے ساتھ قبول فرمایا۔

مولانا کے اس اصول استغناء سے ایک نازک صورت حال خدام ندوہ کو پیش آئی، سب جانتے ہیں کہ ندوہ اب نام ہے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے وجود مبارک کا، اس کی ساری رونق اور بہار آپ ہی کے دم سے ہے، اندرون ملک میں یا باہر سے بھی مدرسہ کو چندہ آپ کی نسبت سے ملتا ہے اور مل سکتا ہے، مولانا اپنے کسی سفر میں ضمنی طور پر بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ چندہ کی کوئی بات کریں، ادھر مدرسہ کی ضرورت روز افزوں، مولانا معین اللہ ندویؒ کویت میں شریک سفر تھے، وہ کب خاموش رہنے والے تھے حضرت مولانا کی موجودگی میں جو چندہ مل سکتا تھا وہ بعد میں نہیں مل سکتا تھا، مولانا معین اللہ نے اس کی طرف توجہ کی، اور ان کو کرنا چاہئے تھا، مگر مولانا کے مزاج کے خلاف تھا، مولانا معین اللہ صاحب عتاب کا شکار ہو گئے، مولانا نے ایک دو روز بات کرنا چھوڑ دی۔ (میر کارواں ص۔۵۲تا۵۹)

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: کلیسا (یورپ کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ)
مصنف: محمد نفیس خاں ندوی
صفحات: ۴۴۸، قیمت: ۴۰۰
ناشر: سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی۔
ملنے کے پتے: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء، مکتبۃ الشباب لکھنؤ۔

صلیب وہلال کی کشمکش پرانی ہے، البتہ اس میں شدت وقت کے ساتھ آتی گئی، عیسائیت میں تحریفات تو بعثت محمدی سے پہلے ہو چکی تھیں، لیکن جیسے جیسے ان تحریفات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، مذہب پر اشخاص کی اجارہ داری قائم ہوتی گئی اور حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے ان کے پیروکار دور ہوتے گئے، نتیجہ کے طور پر ان کی اسلام دشمنی میں بھی شدت آتی چلی گئی، پھر وہ وقت بھی آیا جب عیسائیت کے مظالم کی داستان لکھنے سے خود عیسائی مورخین کے قلم کانپنے لگے، منصف مزاج مورخین نے ان مظالم کو لکھتے ہوئے احساس ندامت کا برملا اظہار کیا ہے، مسخ شدہ عیسائیت کی مسائل تہذیب جدید نے اسلام کو اپنا حریف متعین کیا اور پھر اس کو مٹانے کے لیے علمی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ہر طرح کی کوششیں کر ڈالیں، سرد جنگ میں افترا پردازیوں، ہرزہ سرائیوں اور بے انصافیوں کی ساری حدیں ٹھیک اسی طرح پار کر ڈالیں جیسے گرم جنگ میں مظالم کی حدیں پار کر ڈالیں، بلکہ یہ کہیے کہ عیسائیوں نے اسپین میں مسلمانوں پر ظلم کر کے دنیا کو ظلم وٹارچر کرنے کے طریقے سکھائے، آج بھی محرف عیسائیت کا علمبردار امریکہ اسلام کو ہی اپنا مدمقابل سمجھتا ہے، اس کی گھیرا بندی کے لیے وہ نت نئے جتن کرتا ہے، چنانچہ اس وقت ایک طرف اس نے محمد بن سلمان کو مشن پر لگا رکھا ہے، دوسری طرف اس کی نظر میں ''بے لگام'' اردوغان کو گھیرنے کی تیاریاں کر رہا ہے، امریکہ چونکہ کیپٹلزم کا حامی وحامل ہے، سوویت یونین کے زوال کے ساتھ سوشلزم اور کمیونزم کو بھی زوال ہو چکا، امریکی بالا دستی کے ساتھ کیپٹلزم کے نظریہ کو عروج حاصل ہوا، امریکہ کے سامنے بھی یہ حقیقت تھی کہ اس کے مدمقابل اب کوئی نظریہ اور نظام نہیں سوائے اسلام کے، جس کے عروج واحیاء کی طاقت ور جنگ عین اس وقت ترکی میں نجم الدین اربکان اور عالم عربی میں الاخوان لڑ رہے تھے جس وقت سوویت یونین ٹوٹ رہی تھی، اس لیے امریکہ نے بجا طور پر اسلام کو اپنا مدمقابل سمجھا، پھر اسلام کی کمر توڑنے کے لئے اس نے گزشتہ دو دہائیوں میں جو مظالم کیے ہیں وہ صرف عیسائی مظالم کی تاریخ نہیں بلکہ مجموعی طور پر مظالم کی تاریخ میں سب سے زیادہ اور سب سے بھیانک ہیں، عیسائیت کے علمبرداروں نے انسانیت کو پوری طرح شرمسار کیا بلکہ حیوانیت کے حدود بھی پار کر دیے۔

چونکہ تہذیب اسلامی کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے، اس لیے اس کو آفاقیت وقطعیت وابدیت بھی حاصل ہوئی ہے، اس کے مٹانے کی کوششیں ہر دور میں ہوتی رہیں اور اس دور میں بھی شدت سے ہو رہی ہیں، دنیا کی تمام تہذیبیں اگرچہ باہم متصادم اور بالا دستی کے لئے باہم برسرِ پیکار رہی ہیں، لیکن متعدد مرتبہ تاریخ نے وہ منظر دیکھا ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اسلام کے خلاف متحد ہو کر مقابلے پر آئے، جس کی سب سے نمایاں اور موثر مثال سلطنت عثمانیہ کے استیصال وتقسیم کے موقع پر نظر آئی۔

زیر نظر کتاب میں عیسائیت کی مسخ شدہ شکل اور اس کی حامل

مغربی تہذیب، اس کے عناصر ترکیبی، اس کے نقائص، اس کی نشأۃ ثانیہ اور اس کے عروج کے اسباب، اس کے مظالم، اس کی دھاندلیوں اور بے انصافیوں کا تحقیقی وعلمی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس جائزہ کی حسن تکمیل کے لئے کتاب کو ۱۲ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، سب سے پہلے ''عیسائیت کے مصادر'' پر نہایت عالمانہ گفتگو کی گئی ہے، پھر ''عیسائیت کا پس منظر'' بیان کیا گیا ہے، ''عیسائیت کی تدوین واشاعت'' پر محقق ومدلل گفتگو کی گئی ہے، ''مسیحیت میں کلیسا کے کردار'' کو واضح کیا گیا ہے، پھر ''کلیسا کی حکمرانی'' اور ''مسیحیت کے دور ظلمات'' پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ ابواب گویا اس کتاب کے اگلے حصے کی تمہید ہیں، کیوں کہ کتاب کا اگلا حصہ شاید اس کتاب کا اصل موضوع ہے، بلکہ اس حصے میں بیان کی گئی تاریخ کی روشنی میں موجودہ عہد کا چہرہ بھی دیکھا جاسکتا ہے، اس کے آئینے میں ان کی اور پھر اپنے زوال کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے، آگے مصنف نے ''کلیسا کی اخلاقی صورت حال'' کا منصفانہ جائزہ لیا ہے، پھر ''عورت کلیسا کی نظر میں'' عنوان قائم کر کے مغرب کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کیا ہے، اس سے آگے بڑھ کر ''رہبانیت اور مسیحی معاشرہ'' باب قائم کر کے مسیحی تہذیب میں پائے جانے والے متضاد تصورات اور الگ الگ انتہاؤں کو بیان کر دیا ہے، ذرا غور تو کیجئے ایک طرف رہبانیت کی تعلیم ہے تو دوسری طرف جنسی بے راہ روی، زنا، ریپ کلچر کی بدترین مثال ہے، یوں تو یہ پوری کتاب منطقیت اور حسن ترتیب کا نمونہ ہے مگر ''عورت کلیسا کی نظر میں'' باب کے بعد رہبانیت پر گفتگو کر کے مصنف نے آئینہ دکھانے کی خوب کوشش کی ہے، اس کے بعد ''کلیسا اور اسلام'' کے عنوان سے کلیسا کی اسلام دشمنی پر تفصیلی اور مفصل و مدلل اور منصفانہ گفتگو کی ہے، آخر میں ''کلیسا کے سنگین مظالم'' اور ''یورپ کی نشأۃ ثانیہ'' پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس اچھوتی اور منفرد طرز کی علمی تاریخ کی ترتیب وتدوین پر اس کے جواں سال مصنف نفیس احمد خاں ندوی شکریے کے مستحق ہیں، وہ معروف صاحب قلم ہیں، مذہبی حلقوں اور تعمیری سوچ رکھنے والے اہل علم کے درمیان ان کا نام محتاج تعارف نہیں، انھوں نے پوری بے لوثی، دیانت داری اور انتھک کوششوں کے نتیجہ میں یہ بیش قیمت تصنیف پیش کی ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علمی وتحقیقی معیار کی پاسداری کی گئی ہے، مومنانہ نقطۂ نظر سے سرِ مو انحراف نہیں کیا گیا ہے، ناقدانہ طرز اپنایا گیا ہے، یہ الگ بات کہ اس خالص علمی کتاب میں بھی کہیں کہیں اسلوب خطابی کی جھلک نظر آتی ہے، مگر میرے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں بلکہ علمی موضوعات کی خشکی دور کرنے کے لئے اسالیب کی تقلیب وآمیزش اچھی چیز ہے، ان سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں مغربی مصادر سے بھر پور استفادہ کیا گیا ہے اور بنیادی مصادر Original Sources کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، اس کتاب کی تیاری میں مصنف نے جس عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ آپ کتاب کے آخر میں دی گئی مراجع ومصادر کی فہرست سے کر سکتے ہیں، جہاں عربی کی صرف پانچ، اردو کی چونتیس اور انگریزی کی ۱۴۰ کتابوں کی فہرست درج ہے، مراجع کی یہ فہرست نہ صرف کتاب بلکہ صاحب کتاب کی قدر ومنزلت اور ان کے علمی مقام میں اضافہ کرتی ہے۔

عرصے سے اس طرح کی کتابوں کی تصنیف کے رجحان کا فقدان نظر آتا تھا، بالخصوص فارغین مدارس کے یہاں علمی وتصنیفی ذوق ناپید ہوتا جارہا تھا، تصنیف وتالیف کے نام پر عجیب عجیب نا معقول یا زیادہ سے زیادہ حصول برکت وعارضی فوائد کے لئے کچھ چیزیں وجود میں آرہی تھیں، ہماری نسل کے اہل قلم میں نفیس صاحب نے یہ کتاب پیش کر کے نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے، یقیناً نہ یہ موضوع نیا ہے اور نہ اس کا مواد، بے شمار اہل قلم نے کلیسا کی تاریخ، تہذیب اور اس کے اخلاقی دیوالیہ پن، علم دشمنی اور پھر علمی خیانت کو موضوع بنایا ہے اور اس پہلو سے اسلام کی خدمت انجام

دی ہے، خود عیسائی مؤرخین کی تحریریں اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں، ایک مکمل ومرتب کتاب کی حیثیت سے اس کتاب کو انفرادیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس میں مصنف نے ان تمام پہلوؤں کو یکجا کر دیا ہے اور ان ہی کے مصادر کو سامنے رکھ کر یکجا کرنے کی سعی مشکور کی ہے، انھوں نے اپنے مقدمہ میں اس کتاب کو بانیان ندوہ کی خدمات سے جوڑا ہے، بجا طور پر ان کو یہ حق ہے کہ وہ اس کتاب کا رشتہ مغربی تہذیب اور اس کے علمبرداروں کی خیانتوں کے ہندستان میں اولین ناقدین علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار و خدمات کا امتداد قرار دیں، ندوہ اور ندویت سے مصنف اور کتاب کے رشتے کے تناظر میں یہ بات ٹھیک ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغربی تہذیب اور مغربی بے اعتدالی اور مغرب کے افکار و نظریات کے ہندوستانی ناقدین اور اس کو بے نقاب کرنے والے اہل قلم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو نمایاں اور اولین مقام حاصل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ جب اس حوالے سے ''برصغیر کا وقار بحال ہونے'' کی بات کی جائے تو پوری وسیع النظری اور مکمل اعتراف کے ساتھ ان کا تذکرہ ضرور کیا جائے، کیوں کہ مغرب کی تنقید کی کوئی تاریخ مودودی اور اقبال کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، اس لیے یہاں بہر حال ان کا ذکر ہونا ہی چاہیے تھا۔

بہر حال مصنف لائق صد ہزار مبارکباد ہیں کہ انھوں نے عصر حاضر میں تہذیب جدید کے علمبرداروں کی بے تہذیبی کا ناقدانہ اور عالمانہ جائزہ پیش کر کے گراں قدر خدمت انجام دی ہے، ایسی کتابوں کے لیے لازمی ہے کہ اصل کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کم از کم ان کی عالمی زبان انگریزی اور لسان قوم ہندی میں اشاعت ہونی چاہیے، ہمارے اردو ذخیرے میں متعدد ایسی کتب ہیں جن کو ان دو زبانوں میں شائع ہو کر ہندوستان کے ہر بک اسٹال پر پہنچنا چاہیے تھا مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا، کہیں یہ کتاب بھی اگر اسی زمرے میں شامل ہوگئی تو اس کتاب کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔

اس کتاب میں مسیحیت کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے اس کو یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر سمیٹ دیا ہے، ص ۲۳۶ پر وہ لکھتے ہیں ''بلاشبہ اس وقت دنیا کے کسی خطہ میں کوئی قوم یا جماعت ایسی نہیں ہے جو مغربی اقوام یا مغرب زدہ ممالک کے عقائد ونظریات کی مخالفت کر سکے، سب اسی جاہلی فلسفہ اور مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل ومعتقد ہیں.....'' یہیں سے اس بات کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف محترم اس سلسلہ کو دراز کریں اور نشأۃ ثانیہ سے اب تک کی تاریخ کا ناقدانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں، جس کی اشد ضرورت ہے، آج سے تقریباً ۵۵ سال پہلے مولانا علی میاںؒ نے مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش پر اپنے جرات مندانہ اور قدرے ناقدانہ ومصلحانہ موقف کا اظہار کیا تھا، مگر اس طویل عرصہ میں تاریخ میں کئی اور ابواب کا اضافہ ہوگیا، مسیحی بالا دستی بلاد حرمین میں قائم ہوگئی اور وہ کشمکش مغرب کی بالا دستی تسلیم کر لینے بلکہ اس کے سامنے سپر ڈال دینے پر منتج ہوئی، اب ضرورت ہے کہ اس عرصہ کی تاریخ کو مرتب کیا جائے، لیکن یہ کام بہت مشکل اور بڑی جرأت کا ہوگا، کیوں کہ مصنف کو سادہ لوحی اور یک رخی سے آگے بڑھ کر یورپ کی نشأۃ ثانیہ پھر اس کے عروج اور مسلمانوں کے زوال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ہوگا، ان کو کہیں نہ کہیں اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا ہوگا کہ جو چیزیں مغرب کے عروج کا سبب بنیں وہی مسلمانوں کے زوال کا سبب ثابت ہوئیں، ان کے سامنے یہ حقیقت بھی آئے گی کہ عہد جدید میں مغرب کی بالا دستی کے لئے مغرب سے زیادہ اسلامی دنیا کے نمائندوں اور خدمت اسلام کا ڈھونگ رچانے والوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی خدمت انجام دی ہے۔

بہر حال کتاب کی طباعت عمدہ ہے، البتہ اندرون کتاب تزئین اور چھپائی وغیرہ کچھ قدیم عہد کی یاد تازہ کرتی ہے، ضرورت ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی طباعت جدید معیار اور جدید رنگ و آہنگ (Style) کے ساتھ ہو۔

اس کتاب پر علمی دنیا کے مشہور و معروف محقق و صاحب قلم ڈاکٹر محمد اکرم ندوی کا مقدمہ ہے، مقدمہ یا تو محض برکت اور تائید کے لیے لکھا جاتا ہے، یا پھر وہ کتاب کی جان، اس کا مغز اور اس کا خلاصہ ہوتا ہے، پہلی صورت پر ''مقدمہ'' کا اطلاق سرے سے نہیں ہوتا، اسے تقریظ یا تائیدی کلمات کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے، ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ تو دوسری نوع کا ہے، مگر ان کی دوسری تحریریں پڑھنے کے بعد میرا یہ احساس ہے کہ اس مقدمہ میں انھوں نے تکلف سے کام لیا ہے، یہ مقدمہ نہ اس کتاب کے معیار و مواد کا حق ادا کرتا ہے اور نہ ہی نو وارد مصنف کی پختہ علمی کاوش کی کما حقہ حوصلہ افزائی ، میں نے فاضل مقدمہ نگار کی بعض تحریروں کو دیکھا ہے کہ وہ ادنی سی چیزوں کو پیش کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور پوری وسعت قلبی کے ساتھ مبالغے کے دہانے کھول دیتے ہیں مگر معلوم نہیں کیا وجہ رہی کہ اس پر جوش اور ہوشمند عالم کے قلم سے نکلی اس کتاب پر ان کا مقدمہ کسی قدر خشکی و تکلف کی شکایت چھوڑ گیا، خود مصنف کو چاہیے تھا کہ موضوع کی اہمیت، کتاب کی ضخامت اور علمی اسلوب کے تقاضے کے سبب وہ ایک تفصیلی اور طاقت ور مقدمہ لکھتے، جس سے نہ صرف موضوع کا تعارف ہوتا اور اس کام کی اہمیت اجاگر ہوتی بلکہ اس موضوع پر ہوئے کام سے اس کا موازنہ کر کے اس کی انفرادیت واضح کر دی جاتی، اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنی مختصر تحریر میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے مگر تشنگی اور کتاب کا معیار کچھ اور کا طالب تھا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے علمی ذخیرے میں گرانقدر اضافہ ہے، مصنف علمی دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں، ہمیں امید ہے کہ مختلف حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی اور ان کی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی، اللہ تعالیٰ ایسی علمی و دینی خدمات کے لئے ان کے قلم کو جاری و ساری رکھے۔

.....

نام کتاب: نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل

مصنف: محی الدین غازی

صفحات: ۱۳۲ قیمت: ۱۰۰ روپئے

ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس،
9891051676

مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر نظر کتاب ایک بہترین فکری و علمی کوشش ہے، اتحاد امت کے کھوکھلے نعروں کو عملی شکل دینے کی مبارک جدو جہد کا حصہ ہے، اس کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فکر تطبیق بین المسالک پر غور و خوض کرنے اور اس کی طرف ایک ٹھوس قدم بڑھانے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، مصنف کتاب کے نزدیک اتحاد دیگر فرائض کی طرح ایک فریضہ ہے، شاید اسی لیے انھوں نے اس فرض کی ادائیگی کے لئے شریعت میں سب سے اولین فریضے کی حیثیت رکھنے والے ''فرض نماز'' کو موضوع بنا کر اتحاد امت کے قیام کی ایک بہترین کوشش کی ہے، اس کتاب میں ان کی کوشش کچھ اس طرح رہی ہے کہ عملی تواتر کے حوالے سے متعدد فقہی مسالک میں رائج نماز کے طریقوں کے درست ہونے پر اتفاق کر کے نماز سے متعلق اختلافات کو ختم کیا جائے، اور اب ان بحثوں سے آگے نکل کر دیگر مسائل پر اور اتحاد امت کے دیگر پہلوؤں پر کام کیا جائے۔

انھوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''نماز جو دین کا ستون ہے امت کو غیر معمولی تواتر کے ساتھ ملی ہے اور حد درجہ محفوظ ہے، نماز کے طریقے کو غیر محفوظ قرار دینا اور اس کی تصحیح کی تحریک چلانا سراسر نامناسب اور غیر مطلوب کوشش ہے'' (ص ۱۱)، نماز جیسی عظیم الشان عبادت مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر تھی، اس کی آغوش میں آ کر شاہ و گدا ایک ہو جایا کرتے تھے، لیکن آج نماز ہی کے نام پر بکھیڑے کھڑے کر دیے گئے، ہر ایک اپنے مسلک کے اثبات میں کوشاں

نظر آنے لگا اور دوسرے کے مسلک کی تضعیف وتنقیص میں حد سے گذرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسجدیں تقسیم ہوگئیں، جماعت میں تفرقہ پڑ گیا اور نماز جیسی عبادت کو بنیاد بنا کر دلوں میں نفرت کے بیج ڈال دیے گئے، مصنف نے ''عالمی نماز کا سبق آموز منظر'' عنوان قائم کر کے حج کے دوران ایک امام کی اقتدا میں دنیا بھر کے مختلف الخیال اور مختلف مسالک کے لوگوں کے نماز ادا کرنے کا ذکر کیا ہے اور آخر میں بڑے کرب کے ساتھ لکھا ہے ''نماز کی ہیئت پر امت کا جتنا زیادہ اتفاق ہے وہ حیرت انگیز ہے، لیکن اس اتفاق کے باوجود نماز کو لے کر امت میں جتنے زیادہ جھگڑے ہوتے ہیں وہ اور بھی زیادہ حیران کن ہیں'' (ص ۱۳)۔

صحیح بات اور مشاہدے کی بات تو یہ ہے کہ جو جس طریقے سے نماز کا عادی ہے، وہ اگر کسی کو بھی ذرا مختلف طریقے سے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو مختلف طرح کے گمان کرنے لگتا ہے اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ جب ایک عام آدمی اس طرح کے استفسار کے ساتھ کسی صاحب علم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو اسے مزید مایوسی ہاتھ آتی ہے، اس کو وہاں اپنے مسلک کے صحیح ہونے کی تعلیم دی جانے لگتی ہے، حالانکہ نماز کے یہ تمام طریقے امت کو رسول اللہ ﷺ سے صحابہؓ نے سیکھ کر سکھائے ہیں، مصنف نے بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ ہر مومن کے دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی پوری زندگی سنت کے مطابق گذرے، اب ظاہر ہے کہ نماز تو سرفہرست ہے، ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اس کی نماز سنت کے مطابق ہو، جس کا ایمان جس قدر طاقت ور ہوگا اس کی یہ خواہش اسی قدر شدید ہوگی، لہذا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کے دل میں یہ جذبہ سب سے زیادہ رہا ہوگا، اسی طرح درجہ بدرجہ قیاس کرتے جانا چاہیے (ص ۱۳)، پھر یہ بھی طے شدہ ہے کہ نماز عملی طور پر پڑھ کر دکھائی اور سکھائی گئی ہے، سوال یہ ہے کہ جب اس قدر عملی تواتر کے ساتھ نماز امت کو ملی تو پھر نماز ہی کو لے کر اس قدر اختلافات کیوں وجود میں آ گئے، اس کا جواب بہت واضح اور مدلل طور پر مصنف نے ''نماز کے اختلافات کی حقیقت'' کے تحت دیا ہے، جسے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو اختلاف تصور کیا گیا وہ درحقیقت تنوع تھا، نماز کے بعض امور رسول اللہ نے ہمیشہ اور تا عمر ایک ہی طرح سے انجام دیے اور بعض امور میں تنوع اختیار کیا، چنانچہ جس نے آپ سے جو طریقہ سیکھا اسی پر عمل کیا، تغیرات زمانہ کے ساتھ جب فقہ کی تدوین کا زمانہ آیا تو جس علاقے میں جو طریقہ رائج تھا اسی کو مدون کر دیا گیا، لیکن زمانے کی ستم ظریفی کہ گزرتے دنوں کے ساتھ اپنے طریقے کو افضل ثابت کرنے کی ہوڑ شروع ہوئی اور پھر اس تنوع کو اختلاف بنایا گیا، حتی کہ وہ مکروہ دور بھی آیا جس میں اس اختلاف کو غیر مسلموں کی عدالت میں لے جایا گیا اور اس تنوع کے سبب مسجدوں کا تقدس پامال ہونے لگا، فقہی مسالک کے متبعین مسجدوں کے اندر باہم دست وگریباں ہونے لگے، یہ سب نتیجہ تھا صرف اور صرف اس کا کہ مسنون طریقہ نماز کے تنوع کو سبب اختلاف بنا دیا گیا اور پھر اپنے اپنے مسلک کی مضبوطی اور حفاظت واشاعت کے لئے تدبیریں کی جانے لگیں اور دلائل کے انبار لگائے جانے لگے، اپنے مسلک کے اثبات اور دوسرے کی نفی کرنے کی غرض سے علم وتحقیق کے میدان سر کیے جانے لگے، مصنف نے اس موقع پر بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔

''اپنے اپنے طریقے کو افضل اور راجح قرار دینے کے لیے بالعموم اللہ کے رسول ﷺ سے مروی حدیثوں اور صحابہ وتابعین سے مروی آثار کو دلیل بنایا گیا، اور ایک زبردست حقیقت پس پردہ چلی گئی کہ نماز کے یہ سارے طریقے امت کو عملی تواتر کے ذریعہ ملے ہیں، اگر یہ حقیقت ذہنوں میں تازہ رہتی تو نماز کے مختلف طریقے اختلاف کا سبب نہیں بنائے جاتے''۔ (ص ۱۸)

مصنف کے اس خیال سے کلی طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ائمہ مجتہدین نے امت کو نماز سکھایا نہیں بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں رائج

نماز کے طریقوں کی تحقیق وتدوین کی، لیکن مسئلہ تب کھڑا ہوا جب بعد کے فقہاء نے وکالت کا راستہ اپنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلک کو شریعت پر ترجیح دی جانے لگی اور پھر طاقت ورترین دلائل کو بھی کمزور یا منسوخ ثابت کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔

مصنف نے ''نماز کے اختلافات کی حقیقت'' پر گفتگو کی ہے اور اس کو اختلاف کے بجائے سنت کا تنوع باور کرایا ہے، اس کی ہیئت عملی کا تواتر سے منقول ہونا ثابت کیا ہے، پھر ''عملی تواتر'' اور ''عملی تواتر کی متبادل تعبیریں'' کے عنوان پر بڑی مفید وفقیہانہ گفتگو کی ہے، مختلف جزئیات کو موضوع بنا کر اس تنوع کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، اپنی اس کوشش کو مفید تر بنانے کے لئے انھوں نے انتہائی اہم مباحث مثلاً ''اختلاف تنوع کیا ہے''، ''اختلاف تنوع میں تشدد حرام ہے'' اور ''افضل عمل کی بحث بھی اعتدال چاہتی ہے'' پر بڑی معتدل اور جرأت مندانہ گفتگو کی ہے، پھر اپنے موقف کی تائید میں اساطین علم اور اصحاب تفقہ کے بیانات و دلائل نقل کیے ہیں، انھوں نے اختلاف کے اسباب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کم از کم نماز اور فرض نماز کے متعلق اہل علم کے درمیان رائج اس خیال کی تردید کی ہے کہ فلاں علاقے میں صحیح روایت نہیں پہنچی اس لیے وہاں کے لوگ اس پر عمل نہ کر سکے، ان کی پوری گفتگو پر غور کرنے کے بعد نماز کے باب میں ان کے اس نکتہ سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، انھوں نے کتاب کے آخر میں فقہ کے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت پر بھی گفتگو کی ہے، شدت پسندانہ رویے اور ناسخ ومنسوخ کی بحث میں بے اعتدالی پر بھی گفتگو کی ہے، خلاصہ بحث لکھتے ہوئے انھوں نے یہ بات لکھ دی ہے کہ ''طریقے پر جھگڑنے کے بجائے کیفیت پر توجہ دی جائے''۔ ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو ''عقل و منطق کا بھی تقاضا ہے، اور سنت کے فہم اور اس سے غیر مشروط محبت کا بھی تقاضا ہے کہ نماز کی ظاہری شکل کو اختلاف کا موضوع نہ بنایا جائے، دور اول سے منقول نماز کے تمام طریقوں کو درست اور مسنون مانا جائے، اور ایک دوسرے کی نماز کو قدر اور احترام کی نظر سے دیکھا جائے''۔ (۱۲۹-۱۳۰)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امت کے سنجیدہ طبقے کو اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے اور اس کتاب کے مباحث کو آگے بڑھانا چاہیے، عملی طور پر اپنے درمیان اس فکر کو رواج دینا چاہیے، یاد رکھنا چاہیے کہ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے جو دہائی دی ہے، وہ اسی وقت سنی جا سکتی ہے جب مدارس میں قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس کو مسلکی اور نظریاتی رنگ سے آزاد کیا جائے، تفسیر وحدیث کو پڑھاتے ہوئے کسی ایک مسلک کے اثبات اور دیگر مسالک کی تضعیف وتنقیص کا رویہ اگر جاری رہا تو ایسی کوئی بھی کوشش ناکام ہی رہے گی۔

مصنف لائق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بنیادی ماخذ ومراجع سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بہترین کتاب پیش کی، اس موضوع پر اس طرح کی یہ پہلی تصنیف ہے، حالانکہ اس سے قبل مسلکی رواداری کو فروغ دینے کے لئے صحابہ کرام کے طرز اختلاف کو موضوع بنایا جا چکا ہے، ائمہ مجتہدین کے درمیان باہمی قدر واحترام کی روایتوں کو ضبط تحریر میں لایا جا چکا ہے، خود شاہ صاحب کی کتاب ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' اس سلسلہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے مصنف نے بھرپور استفادہ بھی کیا ہے، شیخ عوامہ کی کتاب بھی اس سلسلہ کی اہم اور مفید کڑی ہے، بہرصورت یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے اور وقت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے، بالخصوص دعوت وتبلیغ سے وابستہ افراد اور فقہ و افتاء سے متعلق لوگوں کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس نہج پر معاشرے کی تعمیر کے بارے میں سوچنا چاہیے، جس سے دوریاں ختم ہو سکیں، اور سراپا جائز بلکہ متواتر اعمال کو لے کر امت میں پیدا ہوئے انتشار کو اتحاد ویگانگت اور میل محبت میں تبدیل کیا جا سکے۔

.....

نام کتاب: تصویر وطن

مصنف: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

صفحات: ۲۵۶

ناشر: مرکز ثقافت وتحقیق، علی گڑھ

ملنے کے پتے: مکتبہ ندویہ لکھنؤ، پاریکھ بکڈپو، لکھنؤ، مکتبہ جامعہ، علی گڑھ

مبصر: کمال اختر قاسمی

ہندوستانی مسلمان متنوع مصائب ومشکلات سے دوچار ہیں، مشکلات وآلام زبوں حالی اور شکستگی کسی قوم کی تقدیر کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل سبب شعور وبصیرت و دوراندیشی، بیدار مغزی اور سلیقہ مندی کو روبہ کار نہ لانا ہے۔

امت مسلمہ ہندیہ نے نہ تو کبھی ایسی قیادت پر بھروسہ کیا جس کی قیادت میں اپنے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کرے اور حال کو سنوارے، اور نہ ہی کوئی اپنی مضبوط قیادت میسر ہوئی جو ذاتی اغراض و مقاصد، مسلکی تعصب اور شدت پسندی سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں کی مناسب سمت کی طرف راہنمائی کر سکے، جس کا نتیجہ ہوا کہ مسلمان بلا کسی ہدف ومشن کے اپنی زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے، جبکہ ان کے بالمقابل دوسری قوم کو بروقت مناسب قیادت اور رہنمائی ملی اور وہ نہایت برق رفتاری کے ساتھ قلیل مدت میں اس مقام تک پہنچ گئی جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کی رسائی کے دور دور تک کوئی امکان بھی نظر نہیں آرہے ہیں۔

جبکہ مسلمانوں کی اس وطن عزیز میں صدیوں پر محیط حکومت رہی، نظم وانصرام کے فیصلے ان کے ہاتھ میں رہے، اور ان سب سے بڑھ کر آج بھی مسلمانوں کے پاس قرآن وسنت جیسے عظیم انقلابی مصادر موجود ہیں، جن خصوصیت کے ساتھ یہ رہنمائی موجود ہے کہ ہم جہاں بھی ہوں وہاں کے احوال وکوائف سے مکمل واقف رہیں، دشمن ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ان کی سازشوں کو سمجھنا اور ان کے حربوں اور ان کی شرارتوں کا حکمت عملی کے ساتھ جواب دینا یہ سب مسلمانوں کا امتیاز ہونا چاہیے۔

لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے کبھی ان امور پر توجہ نہیں دی، اور نہ ہی مسلمانوں کو بیدار کرنے کی عملی کوشش کی گئی۔

زیر نظر کتاب ''تصویر وطن'' بیدار مغز اور ملکی حالات ومنظر نامے پر گہری نظر رکھنے والے بے باک نوجوان عالم دین مولانا طارق ایوبی ندوی صاحب کے ان ادارتی مضامین کا مجموعہ ہے جو ایک مؤقر مجلّہ ''ندائے اعتدال'' میں لکھے گئے تھے، ماہنامہ ندائے اعتدال اپنے مضامین اور بے لاگ تبصرہ اور تجزیہ کے لئے مشہور ومعروف اور علمی حلقہ میں مقبول ہے، جس کی ادارت کی ذمہ داری برادر مکرم ومحترم ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب ادا کرتے ہیں۔

بہر حال اس کی شدید ضرورت تھی کہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح صورتحال پر تفصیلی معلومات یکجا ہوں، تاکہ ان کی روشنی میں امت کے غیور افراد کوئی لائحہ عمل تیار کر کے مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کر سکیں، اللہ جزائے خیر دے مولانا موصوف کو کہ انہوں نے اس کی طرف توجہ کی اور اپنے مضامین کو نہایت مرتب اور منظّم انداز میں کتابی شکل دے کر وطن عزیز اور مسلمانوں کے متعلق زبردست علمی وفکری اثاثہ فراہم کر دیا۔

اس کتاب میں وطن عزیز کی صورتحال پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، دشمن قوتوں کی سازشوں کو آشکارا کیا گیا، ساتھ ہی اپنوں کی غفلت شعاری، سیاسی کجی اور مسلمانوں کے مستقبل کے تعلق سے کج روی کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی لاپرواہی، سست روی اور غفلت شعاری پر مبنی صورتحال کا مصنف موصوف نے جس دردمندانہ جذبہ سے بیان کیا ہے، اس سے جہاں ملک میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت

کا شدید احساس ہوتا ہے، وہیں مصنف کے امت مسلمہ ہندیہ کے تئیں قائدانہ غور وفکر اور قلبی رنج والم کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے، کتاب کے مقدمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس کوئی تھنک ٹینک نہیں ہے، قیادت کا فقدان ہے، ہر کوئی اپنے مفادات کی راہ پر سرپٹ دوڑا چلا جا رہا ہے، جس بوڑھے کو احساس کی دولت حاصل ہے خوف کے مارے اس کے ہاتھ سے لقمہ گر جاتا ہے، نوجوان اپنے مستقبل کو لے کر تشویش میں مبتلا ہے، کلیوں کے کھلنے سے پہلے مسل دینے کے واقعات خون رلاتے ہیں، پھولوں کو ہر وقت خزاں کی آمد کا خوف ستاتا ہے، خود حکومت میں ملک دشمن عناصر شامل ہیں، معاشرتی، سماجی انفرادی واجتماعی ذاتی اور سرکاری سطح پر استحصال کی کہانیاں ہیں، ظالم مظلوم کو کھائے جا رہا ہے، تعلیم کے نام پر تجارت ہو رہی ہے، تربیت کے نام پر بے مروتی عام ہے، سیاسی افلاس کا یہ عالم ہے کہ قائدانہ کردار رکھنے والی ملت اسلامیہ کے افراد صبح وشام کسی شہ کے در کی گداگری پر مجبور ہیں، اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جو سوچتے ہیں، وہ کچھ کرنے کے لائق نہیں، جو کچھ کرنے کے لائق ہیں وہ یا تو خاموشی کو ہزار نعمت سمجھتے ہیں یا اپنی پسند و ناپسند نا معقول ترجیحات اور بسا اوقات ادنی مفادات کی خاطر قومی وملی مفادات کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ (پیش لفظ، ص:۱۴)

یہ سنت الٰہی ہے کہ تمام اقوام کے حالات میں الٹ پھیر ہوتا ہے، کبھی کسی کے لئے ماحول خوشگوار ہوتا ہے کبھی کسی اور کو عروج و بلندی کا مزہ ملتا ہے، لیکن مضبوط مشن اور نصب العین رکھنے والی قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان تبدیلیوں اور اپنے اوپر آنے والی مشکلات کے اسباب اور ان کے طریقہ علاج پر ضرور غور کرتی ہے، لائحہ عمل تجویز کرتی ہے اور ان مشکلات سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسباب زوال اور مشکلات ومصائب کی وجوہات کو سمجھنے اور ان کے حل کے لئے راستے تلاش کرنے کے بجائے غفلت شعاری میں مگن رہنا اور تقدیر کا رونا روتے رہنا بالغ نظری نہیں بزدلی، کج روی بلکہ غیر مومنانہ طرز عمل ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ ان میں غور وفکر کی جو بھی توانائیاں رہیں وہ مسلکی منافرت پھیلانے میں صرف کی جاتی رہیں، نقد واحتساب کی ساری صلاحیتیں اپنے اپنے مسالک کو غالب کرنے اور مسلکی شدت پسندی کو بڑھاوا دینے میں ضائع کی گئیں۔

مصنف نے اظہار تأسف کے ساتھ مسلمانوں کی اس غیر اسلامی بلکہ مسلمانوں کو بھیانک انجام سے دوچار کرنے والی اور سنگین نقصان پہچانے والی روش کی جگہ جگہ نشاندہی کی، اس کے مضرات اور مستقبل میں پیش آنے والی بھیانک صورتحال سے متنبہ کیا۔ ایک جگہ نقد واحتساب کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن افسوس کہ ہماری ہر چیز کا رخ پلٹ گیا ہے، ''نقد'' کا استعمال مسلکی منافرت پھیلانے کے لئے ہوتا ہے، احتساب اپنے بھائیوں کا کیا جاتا ہے، محض اس بنا پر کہ وہ ہمارے اپنے نظریہ کے مطابق سرگرم عمل کیوں نہیں، اور عجب بات یہ ہے کہ دعویٰ سب کا ایک ہے، کہ راستے سب کے مختلف ہیں، لیکن پہنچنا سب کو کعبہ تک ہے ___ آج تو نعرے جماعتوں جمعیتوں، تحریکوں اور اپنے اپنے اداروں کی سربلندی کے لئے ہیں، قوم وملت کی سربلندی کا تو صرف ڈھنڈورا ہے، جب منزل ایک ہے، مقصد ایک ہے، اصول مقرر ہیں تو پھر راہیں اتنی جداگانہ کیوں کہ تاریخی کردار بھی مسخ ہو جائے: اور ملی تشخص بھی داغدار ہو جائے ___ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یا تو ہمارے ظاہر وباطن میں اختلاف ہے، قومی مفاد کے نام پر عوام کا استحصال ہے، یا پھر آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر بھی ہمیں نظر نہیں آرہی ہے ___ اعداد وشمار اور ہر پہلو سے احتساب کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہم فسادات تو جھیل سکتے ہیں، ڈنڈے تو کھا سکتے ہیں، دوسروں کے آگے ہاتھ تو پھیلا سکتے ہیں، واعتصموا بحبل الله جميعا اور الحب لله

والبغض للہ کا درس تو دے سکتے ہیں، لیکن متحد ہو کر ایک منظم طریقہ کار اور لائحہ عمل نہیں بنا سکتے۔ (ص:۱۹تا۲۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی جو درگت بنتی جارہی ہے اس میں بہت بڑا کردار اس امر کا ہے کہ مسلمان جزئیات اور مسائل کو لے کر آپس میں دستِ و گریباں ہیں، ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کے ساتھ خود کے متعین کردہ طرز فکر کو منزل من اللہ اور دوسروں کے انداز فکر کو ضلالت و گمراہی کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اسلام میں عقائد کے سوا کہیں شدت نہیں ہے، جزوی مسائل کو تو چھوڑ دیئے بنیادی احکامات میں لچک اور وسعت رکھی گئی، لیکن مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ مسلکی سوچ و فکر جو کہ خالص انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے اس میں عقائد سے زیادہ شدت پسندی بلکہ جنوں کی حد تک عصبیت کا بازار گرم کر دیا گیا ہے، ایک دوسرے کو گمراہ بلکہ کافر و مشرک قرار دینے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے، مصنف نے اس طرز عمل کو منفی سوچ و فکر قرار دیتے ہوئے ایسے اذہان کی کی سخت گرفت کی ہے اور اس طرح کی عصبیت کو سخت نقصان دہ قرار دیا۔

مصنف نے وطن عزیز کے عمومی حالات کا بھی جائزہ لیا اور یہاں کے متنوع مسائل کو کتاب کا موضوع بنایا ہے، جدید ترقی یافتہ دور کے تضادات کا اپنے مشاہدات کی روشنی میں عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے، وطن عزیز کے لئے بہت بڑا المیہ ہے کہ یہاں ایک طرف ایسے لوگوں کی بری اکثریت ہے جنہیں انواع و اقسام کی غذاؤں کو ہضم کرنے اور مقدار خوراک کو بڑھانے کے لئے دواؤں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جبکہ دوسری طرف بھوک اور فاقہ میں مبتلا افراد غیر معمولی تعداد میں تڑپ کر جانیں دینے پر مجبور رہو رہے ہیں۔

مصنف نے وطن عزیز کی اس تصویر کو بھی اہمیت کے ساتھ اجاگر کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرنے والی تنظیموں کے حالات بھی افسوسناک ہیں، اتحاد کے نام پر جلسے جلوس اور میمورنڈم کی فہرست تو بڑی لمبی ہے، لیکن اس کا نتیجہ صفر ہے۔

قائدین سے بجا طور پر یہ سوال ہونا چاہیے کہ کیا مسلمانوں کے مختلف مسالک کے درمیان آپ خلوص دل سے اتحاد کے قائل ہیں، وہ لوگ اتحاد کی بات کرتے ہیں مگر رد غیر مقلدیت رد مودودیت جیسے شعبوں کے ذریعہ نوخیز ذہنوں کو مسلکی جنون میں مبتلا کر کے دیگر مسالک اور مکاتب فکر کے درمیان خلیج بھی پیدا کر رہے ہیں، کیا یہ نعرہ اتحاد خلوص پر مبنی ہو سکتا ہے۔ تقریبا یہی حال ان تمام تنظیموں اور جماعتوں کا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی و ملی قیادت کی ذمہ دار ہے، ان تمام تنظیموں کو ضرور محاسبہ کرنا چاہیے، کیا صرف اسٹیج پر چند لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اتحاد و اتفاق کی فضیلت پر تقریر کر کے اتحاد قائم ہو سکتا ہے، جبکہ وہی حضرات اسٹیج سے اترتے ہی اپنی اپنی قیادت کے استحکام کے لئے امت کو فرقہ فرقہ مسلک مسلک میں بٹے رہنے کو ضروری سمجھنے لگتے ہیں، زیر نظر کتاب خاصی طویل ہے، اس میں ان تمام موضوعات سپر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جن کو سمجھنا اور اس پر گہرائی سے غور و فکر کرنا ضروری ہے، ان سب میں مصنف کا جہاں دینی و فکری تعمق نظر آئے گا وہیں سیاسی بصیرت اور صحافتی کمال فن بھی دیکھنے کو ملے گا، ان سب سے بڑی بات مسلمانوں کے تئیں ان کی بے پناہ فکر انگیز اور شدید تڑپ نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ سے بصدق قلب دعا ہے کہ برادر مکرم مولانا طارق ایوبی صاحب ندوی کو ملک و ملت کا پاس دار بنائے اور ان کی خدمت کا شایانِ شان اجر و صلہ نصیب کرے۔ وما توفیقی إلا باللہ۔

☆☆☆

ایک سبق آموز واقعہ والدین کے لئے

(م۔ق۔ن)

ایک عباسی خلیفہ نے اپنے زمانہ کے بعض علماء اور اہل علم سے یہ خواہش کی کہ آپ کچھ ایسے اہم اور موثر واقعات لکھ بھیجئے جنہیں آپ نے خود دیکھا ہو یا سنا یا پڑھا ہو۔ اس خواہش کی تکمیل میں ایک عمر رسیدہ عالم نے لکھا کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو دیکھا ہے۔ جب یہ مرض موت میں مبتلا تھے تو کسی نے کہا ''امیر المومنین آپ نے اس مال کو اپنے بیٹوں سے دور رکھا ہے، یہ فقیر و بے نوا ہیں، کچھ تو ان کے لئے چھوڑنا چاہیے تھا''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے بیٹوں کو بلایا جن کی تعداد دس تھی، جب یہ حاضر ہوئے تو رونے لگے پھر مخاطب ہوکر فرمایا۔ ''میرے بیٹو! جو تمہارا حق تھا وہ میں نے پورا پورا دے دیا ہے کسی کو محروم نہیں رکھا اور لوگوں کا مال تم کو دے نہیں سکتا، تم میں سے ہر ایک کا حال یہ ہے کہ یا تو وہ صالح ہوگا تو اللہ تعالیٰ صالح بندوں کا والی اور مددگار ہے یا غیر صالح ہوگا اور غیر صالح کے لئے میں کچھ نہیں چھوڑنا نہیں چاہتا کہ وہ اس مال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مبتلا ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا قوموا عنی (بس تم سب جاؤ اتنا ہی کہنا چاہتا تھا)

ان عالم صاحب نے لکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک بڑے فرماں روا وقت کے عظیم خلیفہ بنو امیہ کے سب سے خدا ترس خلیفہ اور ایک وسیع مملکت کے مالک تھے، اس کے باوجود ان کی اولاد کو ان کے ترکہ میں سے بیس بیس درہم سے بھی کم ملے لیکن بعد میں میں نے دیکھا کہ ان کے یہ لڑکے سو سو گھوڑے فی سبیل اللہ دیتے تھے تاکہ مجاہدین اسلام ان پر سوار ہوکر جہاد کریں۔ آگے وہ مزید لکھتے ہیں میں نے اس کے برعکس بعض ایسے حکمرانوں اور فرماروؤں کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے اپنا ترکہ اتنا چھوڑا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد جب لڑکوں نے باہم تقسیم کیا تو ہر ایک کے حصہ میں چھ چھ کروڑ اشرفیاں آئی تھیں لیکن میں نے ان لڑکوں میں سے بعض کو دیکھا کہ ان کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے بھیک مانگا کرتے تھے۔ (السیاسیۃ الشرعیۃ للإمام ابن تیمیہ)۔

اس واقعہ میں ان تمام والدین اور سرپرستوں کے لئے درسِ عبرت ہے جو اپنی اولاد کو صرف اور صرف دنیاداری سکھاتے ہیں اور بہتر زندگی گزارنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقوں کو اپنانے میں حجاب محسوس نہیں کرتے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اسباب دنیا سے مالا مال کردیں اور ان کے لئے اتنا ترکہ اور وراثت چھوڑ جائیں جو کئی پشتوں کے لئے کافی ہو لیکن ان آخرت سنور نے اور وہاں کی سرخ روہونے کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا اور نہ ہی اس کی فکر کرتے ہیں۔

☆☆☆